نام کتاب	خلافتِ الٰہیہ
تقاریر	سید العلماء علامہ علی نقیؒ
تالیف	عابد عسکری فاضلِ قم
ترتیب نو	قلب علی سیال
کمپوزنگ	الحمد گرافکس لاہور (فضل عباس سیال)
ناشر	معراج کمپنی لاہور
تاریخ اشاعت	2014ء
طبع	اوّل
قیمت	

ملنے کا پتہ

معراج کمپنی

LG-3 بیسمنٹ میاں مارکیٹ غزنی سٹریٹ اُردو بازار لاہور۔

فون: 0321-4971214/0423-7361214

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

عرضِ ناشر

مکرمی و محترمی______________السلام علیکم ورحمۃ اللہ

''معراج کمپنی'' دینی کتب کی اشاعت کے حوالہ سے ایک جانا پہچانا ادارہ ہے۔ادارہ عرصہ دراز سے دینی کتب کی اشاعت میں اپنی خدمات انجام دے رہا ہے۔ادارے کا مطمع نظر عوام تک بہتر اور سستے ترین انداز میں کتب کی ترسیل ہے۔اللہ تعالیٰ ادارہ ھذا کو اس عظیم کام کی انجام دہی کیلئے بھرپور وسائل عطا فرمائے۔

زیرِ نظر کتاب ''خلافتِ الٰہیہ'' سید العلماء علامہ علی نقیؒ کی دو مجالس پر مشتمل تقریری مجموعہ ہے ۔دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں، جھکائے نہیں جاتے۔ حضرت موسیٰؑ کلام کرنے طور کی بلندی پر جاتے تھے، زمین کے کسی غار میں نہیں جاتے تھے۔عرش اس کا پایۂ تخت ہے مگر زمین اس کی ربوبیت سے خارج نہیں ہے۔ اسی طرح زمین اس کا پایۂ تخت ہے مگر عالم بالا اس کی رسالت سے باہر نہیں ہے۔ لٰہذا رسولؐ جہاں بھی جائے گا، نمازیں پڑھاتا ہوا جائے گا، اقتداء کرتا ہوا نہیں جائے گا، امامت کرتا ہوا جائے گا۔قارئین حضرات اس سے بھرپور استفادہ کریں۔

اُمید ہے آپ ادارہ ہذا کی اس کوشش کو بھی قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے اور کتابِ ھذا سے بھرپور استفادہ کریں گے اور سید العلماء کی قدردانی کا حق ادا کرنے میں بھی کوشاں رہیں گے۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔والسلام

معراج کمپنی لاہور

فہرست مضامین

اَعُوْذُبِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْم

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْم

"اَلْحَمْدُلِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْن وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی سَیِّدِ الْاَنْبِیَاءِ وَالْمُرْسَلِیْن اَبِی الْقَاسِمِ مُحَمَّدٌ خَاتَمِ النَّبِیِّیْن وَاٰلِہِ الطَّیِّبِیْنَ الطَّاہِرِیْنَ الْمَعْصُوْمِیْن اَمَّابَعْدُ فَقَدْ قَالَ اللّٰہُ سُبْحَانَہٗ فِیْ کِتَابِ الْمُبِیْن وَھُوَاَصْدَقُ الصَّادِقِیْن

موضوعِ آیت

قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَ

يْفَةً ؕ قَالُوْٓا اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ

سْفِكُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَ

دِّسُ لَكَ ؕ قَالَ اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْ

هُمَّ صَلِّ عَلٰى مُحَمَّدٍ وَّاٰلِ مُحَمَّ

مجلسِ اوّل

- میں کہتا ہوں کہ اتنا سمجھ لو کہ وہ بھی ہیں، وہ ایسے ہیں کہ ان کی معرفت معیار فضیلت انسان ہوئی۔
- وہ جو رات کو کبھی سونے کا عادی نہ ہو، وہ کیونکر سویا؟ جس کی رات محراب عبادت میں گزرتی تھی، آج لٹا دیئے گئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی راز ہے سونے کا، جس کیلئے روز جاگتا تھا، اسی لئے آج سو رہا ہے۔ بس یہ سو رہے تھے اور جاگنے والا دیکھ رہا تھا۔
- میں کہوں گا کہ یہ نہ سمجھئے کہ جو شے اِدھر سے اُدھر جاتی ہے، اس کی معراج ہوتی ہے۔ جب وہاں والوں کو معراج ہوتی ہے تو یہاں بھیج دیا جاتا ہے۔
- ایسی بات جو آدمی خود ہی جانتا ہو، دوسرے کو علم ہی نہ ہو سکے تو اس میں شرعاً بھی خود اس کا قول ہی معتبر ہوتا ہے۔
- معصوم ابن معصوم، حجت ابن حجت خدا۔ وہ کہہ رہے ہیں میرے ماں باپ تم پر قربان اے مجاہدین کربلا! تم بھی پاک ہوئے اور وہ زمین بھی پاک ہوئی جہاں تم دفن ہوئے۔ کاش! تمہارے ساتھ ہوتا اور اس عظیم کامیابی میں شریک ہوتا۔

خلافتِ الٰہیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾

(تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔تو انہوں نے کہا کہ کیا تو انہیں مقرر کرے گا جو اس میں فساد پیدا کریں اور خونریزی کریں، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں۔ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔)

میں نے عرض کیا کہ ملائکہ بارگاہِ قدس کے طالب علم ہیں۔ طالب علم کو حق ہے کہ جو بات اس کی سمجھ میں نہ آئے، وہ معلم سے پوچھ لے۔اب انہوں نے خالق کی بارگاہ میں سوال پیش کیا۔خالق نے کیا جواب دیا؟ کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

اب مجمع میں ماشاءاللہ طالب علم بھی ہیں اور اُستاد بھی ہیں اور دوسرے

تعلیم یافتہ افراد بھی ہیں طالب علمی اور معلمی کے جو تقاضے ہیں ان سے کون واقف نہیں ہے۔ کوئی طالب علم اُستاد سے کوئی سوال کرے، اُستاد کہے کہ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ تو کیا یہ اس سوال کا جواب ہوا؟ ارے جناب! طالب علم اگر جرأت رکھتا ہے تو وہ کہے گا کہ جنابِ والا! اسی لئے تو پوچھتے ہیں کہ آپ جانتے ہیں، ہم نہیں جانتے۔ اسی لئے تو ہم آپ سے دریافت کرر ہے ہیں۔ تو یقینا کوئی شخص یہ نہیں سمجھ سکتا کہ اس سوال کا یہ جواب ہے۔ ہاں! اسے ہم سوال کا ٹھکرا دینا کہہ سکتے ہیں یعنی جواب نہیں دیا گیا۔ مگر جواب یہ کسی رُخ سے نہیں ہے۔ اب آخر اُستاد ہے اور شاگرد سوال کرر ہا ہے تو وہ کیوں اس کے سوال کو ٹھکرائے؟ حالانکہ اب اس کے بعد کی آیت پڑھئے تو پتہ چلتا ہے کہ خالق اس سوال کا جواب دے گا۔ وہ بھی جانتا ہے کہ جواب نہیں ہوا۔ اگر جانے کہ جواب ہو گیا تو بعد میں پھر کیوں جواب دے؟ تو آخر جب جواب دینا ہی ہے تو ابھی کیوں نہیں جواب دے دیا گیا؟ وہ سوال کرر ہا ہے، اُسے جواب دے دیا جائے۔ پھر جواب بعد میں دیا گیا تو کب؟ تو ہم اس آیت کے بعد بلا فاصلہ دوسری آیت پڑھتے ہیں:

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢـبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ﴿۳۲﴾ قَالَ يٰٓـاٰدَمُ اَنۡۢـبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآٮِٕهِمۡ ۚ فَلَمَّاۤ اَنۡۢـبَاَهُمۡ

بِاَسْمَآىِٕهِمْ ۚ قَالَ اَلَمْ اَقُلْ لَّكُمْ اِنِّیْۤ اَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضِ ۙ وَ اَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَ مَا كُنْتُمْ تَكْتُمُوْنَ (۳۳)

اب پوری آیت فوراً، اس کے آیت کے بعد یہ دوسری آیت، جتنی زیادہ روانی کے ساتھ پڑھو، اتنی ہی جلدی اس آیت کے بعد یہ آیت آجائے گی۔ مگر کیا خود مضمونِ آیت کو دیکھئے؟ یہ واقعہ فوراً اس کے بعد ہوا؟ وہ اس وقت کی بات ہے جب آدم کا پتلا ابھی آب وگل میں بھی نہیں ہے۔ یہ خلقتِ آدم کا سوال ہے۔ تو یہ واقعہ جو بلا فاصلہ اس آیت میں نظر آرہا ہے، یہ جب آدم کا پتلا بصورتِ انسان ذی روح عالم ظہور میں آئے گا، انسانِ مکمل کی شکل میں، جب وہ جلوہ آرا ہوچکے، تب وہ دوسرا واقعہ پیش آیا۔ تو میں کچھ اندازہ ہی نہیں کرسکتا کہ کتنے ہزار برس کا فاصلہ بیچ میں ہے۔ کتنی مدت درمیان میں گزری؟ اُس وقت پھر اس وقت والے سوال کا جواب خالق دے گا۔ تو جب جواب دینا ہی ہے تو ابھی کیوں نہ جواب دے دیا جائے؟

مگر ماشاء اللہ اربابِ فہم ہیں، میں کہتا ہوں کہ اگر ابھی اللہ مصالح اور اسباب سمجھانے لگے تو ایک صورتِ شوریٰ قائم ہوجائے۔ تو جیسے اس موضوع پر تبادلہ خیالات ہونے لگا، انہوں نے سوال کیا، اللہ سمجھانے لگا۔ یہ وجہ ہے کہ صورتِ شوریٰ قائم ہوجائے۔ تو اس وقت جواب نہیں دیا گیا۔ میں تو اپنے انداز میں یوں کہہ سکتا ہوں کہ جیسے خالق نے کہا: منصب میرا، مقرر کرنا میرا کام، تم کون؟ اب اگر خطا کار انسان ہوتا تو جم جاتا کہ بغیر سمجھے نہیں ہٹوں گا۔ مگر یہ

بیچارہ معصوم فرشتہ ہے۔ خالق نے کہا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس نے اپنے گریبان میں منہ ڈالا کہ ہاں! منصب اس کا ہے، مقرر وہ کررہا ہے، ہمیں نہیں بتانا چاہتا کہ اس کے کیا اسباب ہیں؟ تو اس میں دخل دینے کا ہمیں کیا حق؟ خاموش ہوگیا۔ مگر خالق کے ذمہ گویا فریضہ تعلیمی قرض رہا۔ یعنی بحیثیت معلم جو اس کو جواب دینا چاہیئے تھا، وہ نہیں دیا گیا۔

چنانچہ اب جب آدم عالمِ وجود میں آچکے تو اب خالق نے اس دن کے سوال کا جواب دینا چاہا۔ بڑے انتظام و اہتمام سے اور اس کیلئے گویا خاص انتظام کیا۔ وہ کیا؟

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ ۙ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ

قدم قدم پر مفسرین کو دقت پیش آتی ہے اور مجھے ان سے اختلاف کرنا پڑتا ہے۔

بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ﴿۳۱﴾

وہ جیسے خلیفہ میں الجھن پیدا ہوئی تھی کہ کس کا خلیفہ؟ اب یہاں کہا اللہ نے کہ آدم کو تمام اسماء سکھا دیئے۔ اب مفسرین نے ''**اسماء**'' دیکھا، ''**کلھا**'' دیکھا۔ اسماء پر جو الف لام ہے، اُسے نہیں دیکھا تو ترجمہ کردیا کہ سب نام سکھا دیئے۔ اب سب کے نام سکھائے تو جناب! کیڑے مکوڑوں کے بھی نام، جڑی بوٹیوں کے بھی نام، ہر خاروگل کے نام، ہر کس وناکس کے نام۔ غرض ایک ذرہ سے لے کر ستارہ ہائے فلک تک جو کچھ کائنات میں ہے، سب کے نام

سکھا دیئے۔یعنی ایک فرہنگ اور لغت آدم کو بتا دی۔ کیونکہ سب نام، اسماء بھی او رپھر" کلھا" بھی۔ سب اور سب ہیں تو پھر سب۔ جو جو ذہن میں آئے، وہ سب اور جو ذہن میں نہ بھی آئے، وہ بھی سب۔ چونکہ بتانے والا خدا ہے، وہ ہمارے ذہن کا پابند نہیں ہے۔لہٰذا جتنے نام ہم نہیں بھی جانتے، وہ بھی۔ پھر ازل سے لے کر ابد تک سب نام آدم کو سکھا دیئے۔مگر اب بعد میں جو آئے گا، اس کے ساتھ یہ بات بالکل نہیں نبھتی۔

اب یہیں سے بتا دوں کہ غلطی کہاں ہوئی؟ وہ میں نے ابھی اشارہ کیا تھا کہ انہوں نے الف لام کو نہیں دیکھا۔ اب دیکھئے، میں ترجمہ کرتا ہوں۔سب کے لفظ کو میں چھوڑوں گا نہیں۔ اس سے ٹکراؤں گا بھی نہیں۔ پھر بھی دیکھئے کہ وہ سب محدود ہو جاتے ہیں یا نہیں!

الف لام کی اقسام عربی میں بہت سی ہیں۔ ایک ہوتا ہے استغراق کا خود، اس کے معنی سب کے ہوتے ہیں۔ اگر یہ استغراق کا ہوتا تو" کلھا" کہا ہی نہ جاتا کیونکہ استغراق تو خود الف لام میں ہے۔خصوصاً جب جمع پر داخل ہو۔عربی دان حضرات جانتے ہیں۔تو وہ استغراق تو پھر اڑ جاتا ہے۔پھر" کلھا" کہنے کی ضرورت ہی کیا تھی؟ اب اور جو قسمیں ہیں، اس سے بحث اس وقت نہیں۔ ایک الف لام کی قسم ہے عہد۔عہد کے معنی ہوتے ہیں کچھ خاص اشیاء یا افراد کی طرف اشارہ۔اس کی ایک روزمرہ کی مثال آپ کو دے دوں۔ یوم کے معنی کوئی سا دن اور الیوم کے معنی آج۔ یہ الیوم تو آپ بہت سنتے رہتے ہیں۔ایک جانی پہچانی آیت میں، الیوم ہی سے شروع ہوتی ہے۔تو اس کا ترجمہ کیا" آج"۔ یہ یوم کے

معنی آج کہاں سے ہو گئے؟ یوم کے معنی آج کہیں نہیں ہیں۔ کسی لغت میں یوم کے معنی آج کے آپ کو نہیں ملیں گے۔

تو یہ آج کے معنی پیدا ہوئے الف لام سے۔ بالکل لفظی معنی ہیں الیوم یعنی یہ سا دن۔ اب یہ سا دن فارسی میں ہو تو بالکل یہی ترجمہ ہے امروز۔ ہمارے ہاں اس کیلئے مفرد لفظ موجود ہے۔ یہ دن یعنی آج۔ تو اسی طرح الیوم کے معنی ہوئے آج۔ تو جب الف لام کے یہ بھی معنی ہیں، اشارے کے، تو اب جو ترجمہ میں کروں، اُسے دیکھئے۔ آدم کو وہ سب نام سکھا دیئے۔ دیکھئے! سب گیا تو نہیں۔ آدم کو وہ سب نام سکھا دیئے۔ وہ سب نام کیا؟ وہ نام جنہیں فرشتے لاکھوں مرتبہ دیکھ چکے تھے۔ کیونکہ ابوابِ جنت پر لکھے ہوئے تھے۔ عرش پر لکھے ہوئے تھے۔ حورعین کی پیشانیوں پر اکثر لکھے ہوئے تھے۔ تو ان ناموں کو تو فرشتے نہ جانے کتنی مرتبہ دیکھے ہوئے تھے۔ تو انہیں تو ملائکہ جانتے تھے۔ ناموں سے خوب واقف تھے۔ تو وہ نام تھے جو فرشتوں کو پہلے ہی سے معلوم تھے کیونکہ آدم مدرسہ قدرت میں آج طالب علم آیا ہے۔ وہ پرانے طالب علم جو نام ان کے جانے پہچانے ہوئے تھے، وہ سب نام آدم کو بتائے۔ وہ سب یعنی ان ناموں میں سے کسی کو نہیں چھوڑا۔

اور اسی سے اب بعد میں جنہوں نے شروع میں ٹھوکر کھائی اور بعد میں بھی ٹھوکر کھاتے چلے جائیں گے، تو اب جناب! انہوں نے کہا کہ سب نام۔ اب اس کے بعد، بعد میں سمجھ ہی میں نہیں آئے گا۔

ثُمَّ عَرَضَهُمْ عَلَى الْمَلٰٓئِكَةِ ۙ

"پھر ان لوگوں کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا"۔

اب یہاں "هُمْ" انہیں نظر ہی نہیں آیا۔ "هُم" ذوی العقول کی ضمیر ہے۔ چیزوں کو "هُم" نہیں کہتے، انسانوں کو "هُمْ" کہتے ہیں۔ جو صاحبانِ عقل ہوں، جانوروں کو بھی "هُمْ" نہیں کہتے۔ صاحبانِ عقل کیلئے ضمیر ہے جس کا ترجمہ ہمارے ہاں لوگ ہی ہوئے۔ ان لوگوں کو پیش کیا۔ اب یہ لوگ کہتے تو پھنستے کہ آخر وہ کون لوگ ہیں۔ لہٰذا مصلحت یہی دیکھی کہ اس مقام پر سب عالم جاہل بن جائیں۔ جیسے "هُمْ" کے معنی ہی نہیں جانتے۔ لہٰذا کہہ دیا کہ وہ سب نام ان کے سامنے پیش کر کے پوچھے کہ یہ نام بتاؤ۔ اب یہاں جو میں نے عرض کیا، اُس سے قطع نظر کیجئے تو بڑا سوال ہے۔ طالب علم کے ذہن میں، ہر صاحبِ عقل کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوسکتا ہے کہ اگر امتحان ایسا ہو کہ ایک طالب علم کو تو چپکے سے سب بتا دیا اور اس کے بعد سب طالب علموں کو بلا کر پوچھا کہ بتاؤ یہ سب۔ تو یہ امتحان سازشی ہوگا یا نہیں؟ میری تو زندگی یونیورسٹیوں میں گزری ہے۔ تو ایک لفظ کہوں کہ ایک طالب علم کو پرچہ آؤٹ کر دیا۔ مگر بس ایک کیلئے اور اسی کو بلا کر امتحان سب کا لے لیا کہ بتاؤ۔ تو اس طرح کا امتحان جائز ہوگا؟ تو جو ہم ایسے ناقص معلّموں کیلئے جائز نہیں، وہ اس کامل معلم کیلئے جائز کیسے ہوسکتا ہے؟

پھر آدم کی بلندی کیسے ثابت ہوگی؟ تو یہ سب غلطی ہوئی یہ جو الف لام کو نہ سمجھا۔ سب نام سکھائے۔ تو سب نہیں، بلکہ وہ نام جو ان کے دیکھے ہوئے تھے۔ کوئی ثبوت بھی نہیں ہے ازروئے قرآن۔ اس کی ضرورت بھی نہیں کہ الگ ہٹا کر فرشتوں سے صیغہ راز میں وہ نام بتائے ہوں۔ اس لئے فرشتوں کے سامنے ان کو

وہ نام جو نام ان کو معلوم تھے، وہ بتا دیئے آدم کو۔

اور میں کہتا ہوں کہ اسی طرح بتا کر معیارِ تعلیم برابر کیا تا کہ جو انہیں معلوم ہے، وہ ان کو بھی تو معلوم ہو جائے۔ اب اس کے بعد وہی نام نہیں پوچھے جا رہے ہیں جو نام ابھی بتائے تھے۔ وہ بتاؤ تو! ماشاء اللہ یہ کیا محل ہے؟ یہ تو حافظہ کا امتحان ہوا یعنی ابھی ابھی تو بتائے ہیں نام اور ابھی پوچھ رہا ہے کہ نام بتاؤ کہ بھولے تو نہیں۔ تو یہ تو حافظے کا امتحان ہوتا ہے۔ مگر حافظے کے امتحان کا یہ محل ہی نہیں ہے کیونکہ امتحان کا ایک فریق فرشتہ ہے۔ یعنی فرشتوں کی قوم ہے جن کے ہاں سہو و نسیان کو کوئی صحیح نہیں سمجھتا۔ ارے انبیاء میں سہو و نسیان کو کوئی تصور کرتا ہو، ہم تو وہاں بھی تصور نہیں کرتے۔ لیکن ملائکہ میں تو کوئی سہو و نسیان کو داخل نہیں سمجھتا۔ اب جب ایک فریق ایسا ہے جہاں بھولنے کا سوال ہی نہیں ہے تو اب حافظے کے امتحان کے کیا معنی؟ تو اب صورتِ واقعہ کیا ہے؟ اگر یہ صاحبانِ علم الفاظِ قرآن پر غور کرتے تو مسئلہ حل ہو جاتا۔ الگ سے کسی تفسیر کی ضرورت بھی نہ تھی۔ چاہے پھر پورے طور پر معمہ حل نہ ہوتا۔ مگر اصل مفہوم تو سمجھ میں آ ہی جاتا۔ آدم کو وہ سب نام سکھائے۔ اب وہ نام نہیں پوچھے جاتے "ثُمَّ عَرَضَهُمْ"۔ پھر ان اشخاص کو سامنے پیش کیا گیا "فَقَالَ اَنْۢبِـُٔوْنِیْ"، اگر فقط نام پوچھے جاتے تو "هٰذَا الْاَسْمَآءَ"

کہا جاتا۔ پھر یہ نام بتاؤ جو میں نے سکھائے ہیں۔ دیکھو! ان لوگوں کے نام مجھے بتاؤ۔ "اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ"، یہ قول والا صادق نہیں۔ یعنی اگر تمہارا خیال یہ ہے کہ تم زیادہ مستحق ہو۔ انہوں نے کب کہا تھا کہ ہم زیادہ مستحق

ہیں؟ مگر تمہارا تصور اگر یہ ہو، اپنی کم علمی سے، ان کی عصمتِ عمل غلط کو مانع ہے۔ مگر احاطہ علمی ان کیلئے نہیں ہے۔

لہٰذا علم کی کمی کی بناء پر اگر تمہارا خیال یہ ہو کہ تمہیں حق ہے اس منصب کا تو ان لوگوں کے نام بتاؤ۔ میں نے کہا کہ چاہے بعد میں مفسرین کی سمجھ میں نہ آئے کہ وہ لوگ کون تھے؟ مگر لفظی معنی تو ہر صاحبِ علم کو سمجھنے چاہئیں۔ میں کہتا ہوں کہ سمجھ میں نہ آئے کہ کون؟ کوئی تو تھے جن کو پیش کیا اور وہ جنہیں پیش کیا، آدم تو تھے نہیں۔ فرشتے بھی نہیں کیونکہ وہ معرضِ امتحان میں ہیں۔ تو ماننا پڑے گا کہ کسی نوعِ خلقت کے اعتبار سے آدم سے پہلے ملائکہ کے علاوہ کوئی صاحبِ عقل مخلوق موجود تھی۔ تو اب کوئی نہ کوئی تو ہوگا۔ میں کہتا ہوں کہ اتنا تو سمجھ لو کہ وہ جو بھی ہیں، وہ ایسے ہیں کہ ان کی معرفت معیارِ فضیلتِ انسان ہوئی۔

اب امتحان بالکل با اُصول ہے۔ حافظہ کا امتحان نہیں ہے، ذہانت کا امتحان ہے۔ فرشتوں کو وہ نام پہلے سے معلوم ہیں۔ میں نے کہا کہ ابوابِ جنت پر دیکھ چکے، عرش پر دیکھ چکے۔ آدم کو ابھی بتائے ہیں۔ اس طرح نام تو سب سنائیے مگر صورتیں آدم کو نہیں دکھائی گئی ہیں۔ ارے کسی قدرتی انداز میں، کسی قدرتی انداز میں، وہ صلبِ آدم میں آئیں گے۔ مگر یہ کہ ان کی صورتیں دیکھی نہیں ہیں۔ کسی عالم میں کچھ نور دیکھتے ہیں۔ مگر نام دیکھے تو الگ، صورتیں دیکھیں تو الگ دیکھیں۔ یہ کبھی نہ انہوں نے پوچھا، نہ بتایا گیا کہ کون کس کا نام ہے۔

اور جناب! ہمارے لئے یوں بھی مشکل ہے کہ ہم جو نام رکھتے ہیں، اس میں تناسب کا کوئی لحاظ نہیں ہوتا۔ مثل مشہور ہے "برعکس نہند نام زنگی کافور"۔

زنگی ہے کالا، کافور ہے سفید، مگر زنگی کا نام کافور رکھ دیا۔ دیوان متنبی جنہوں نے پڑھا ہے، غالباً وہیں سے لوگوں نے، کوئی متنبی کے دیوان کا حافظ تھا۔ وہیں سے لوگوں نے یہ مثل بنائی ہے نام زنگی کافور۔ اب میں یہاں جانے پہچانے دو نام بتاؤں۔ ہوسکتا ہے کہ مجمع میں کوئی اس نام کے ہوں مگر واقف نہیں ہوں۔ بطورِ مثال کہہ رہا ہوں، خدانخواستہ کسی پر چوٹ کرنا مقصود نہیں کہ پیدا ہوئے۔ ماں باپ نے نام فدا الدین رکھ دیا۔ اب کیا ضروری ہے کہ بہادر بھی ہوں۔ یہ بعد میں ثابت ہوگا کہ بہادر ہیں یا نہیں ہیں۔ ماں باپ نے بس نام رکھ دیا اور وہ عمر بھر فدا الدین کہلائیں گے۔ چاہے کارنامے بھی سامنے آجائیں۔ یا مثلاً بد صورت بچے کا نام شمس الدین رکھ دیا۔ آفتاب رکھ دیا۔ ماہتاب رکھ دیا۔ یا کچھ رکھ دیا۔ نام میں تناسب سے کوئی بحث نہیں لیکن یہ جب ہے، جب ہم نام رکھیں۔ اور جن کے نام بھی خدا رکھتا ہو؟

تو اس کیلئے واقعات بھی ہمارے سامنے ہوں کہ بچہ پیدا ہوا ہے اور بزرگِ خاندان نام نہیں رکھ رہے ہیں۔ وحی کا انتظار ہے۔ جو واقعی اس خاندان کا بزرگ ہے، وہ نام رکھے۔ تو جناب! نام اسی کے رکھے ہوئے اور یہ وہ نام ہیں جو عرب میں نہیں ہوتے تھے۔ ان میں سے کوئی نام کسی کا بعد میں صدیوں چلتا رہے تو کسی کو کہنے کا حق نہیں ہے کہ فلاں کے نام پر نام رکھا۔ جو نام عمومی عرب میں ہوا کرتے تھے، ان میں سوال کیا کہ کس کے نام پر رکھا؟ جو نام قدرت کی طرف سے کسی کو پہلے پہل دیئے گئے ہوں، وہ نام جب رکھے جائیں گے تو کہا جائے گا کہ فلاں کے نام پر نام رکھا۔ لیکن جب خالق نام رکھے گا، وہ بے جوڑ

نہیں ہو سکتے۔ بس قوتِ نظر کی ضرورت ہے۔ دیکھنے والی نگاہ ہونی چاہئے۔ امتحان یہی ہے کہ ایک طرف تو نام بتا دیئے اور اب یہ صورتیں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔ تمہارا امتحان یہ ہے کہ تم بتاؤ کہ کونسا کس کا نام ہے؟ یعنی اپنے ذہن سے اسم اور مسمیٰ میں مطابقت کرو۔ یہ بات بتائے ہوئے سبق سے باہر تھی۔ جو بتایا تھا، اس سے باہر تھی۔

ہمارے ہاں کوئی سوال کورس سے باہر سے آجائے تو جا کر فریاد کرتے ہیں کہ جناب! یہ کورس کے اندر نہیں ہے۔ اب وہاں فرشتہ، ذہانت کا سوال! تو جناب! یہ سوال کیا گیا کہ ان کے نام بتاؤ۔ کونسا نام کس کا ہے؟ بتاؤ۔ بیچارے فرشتے نے کہا:

"لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا"۔

ہمیں کچھ نہیں معلوم سوائے اس کے جتنا تو نے ہمیں بتایا ہے۔

اُسے بھولے ہوں تو مجرم! معلوم ہوا کہ سوال بتائے ہوئے سے باہر ہے لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا۔ سوائے اس کے جو تو نے ہمیں بتایا۔ تو بیچارہ فرشتہ ہماری عربی کی گرائمر جو مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے، وہ پڑھا ہوا نہیں ہے۔ اسے بس ایک ہی ترکیب معلوم ہے۔ ایک "لا" اور ایک "اِلَّا"۔ وہ "لا" اور "اِلَّا" کی ترکیب۔ بس ایک عدد "لَا" آیا، ایک عدد "اِلَّا" آیا، جملہ بن گیا۔ "لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا"، ہم کو کوئی علم نہیں، ہم کو سوا اس کے جو تو نے ہمیں بتایا۔ وہی جملہ اس نے اُحد میں کہہ دیا:

"لَا فَتٰی اِلَّا عَلِیٌ لَا سَیْفَ اِلَّا ذُو الْفِقَار"۔

"لَا عِلْمَ لَنَا اِلَّا مَا عَلَّمْتَنَا"۔

وہی معلوم ہے جو تو نے ہمیں بتایا۔

یہ ہمارے بس کی بات نہیں کہ ہم بتائے ہوئے سے زیادہ بتا سکیں۔

اب ارشادِ قدرت ہوا، للکارا فطرتِ انسانی کے نمائندہ کو۔ اے آدم! تو تو انسان ہے۔ تیری صفتِ خاص ہے، معلومات سے مجہولات کا پتہ چلانا، فکر و نظر کے معنی یہی ہیں کہ جو معلوم ہے، اس سے نامعلوم کا نتیجہ نکالنا۔ فرشتوں کو بتا دے کہ کون کس کا نام ہے؟ بس آدم بڑھے اور انسانی ذہن سے فطرتِ انسانی سے انہوں نے اسماء اور مسمیات میں نسبت دیکھی، مناسبت دیکھی نام میں اور شخصیت میں اور فر فر بتا دیا کہ یہ اس کا نام، یہ اس کا نام۔ کہیں پر کوئی غلطی نہیں کی کہ نمبر کٹ جائیں۔ بالکل کوئی نمبر نہیں کٹا۔ سو میں سے سو کامیابی۔ سب ناموں کو مطابق کر کے بتا دیا۔

اب وہ جو میں کہہ رہا تھا، اس دن کے سوال کا جواب۔ خالق نے اب اس دن کے سوال کا جواب دیا۔ دیکھا تم نے "اَلَمْ اَقُلْ لَکُمْ"، کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا؟ ماشاءاللہ! مجمع میں دو ایک کو تو پہچانتا ہوں۔ ماشاءاللہ اہلِ منبر ہوں گے، مقررین ہوں گے، تو ان سب کو میں ایک حجت دے رہا ہوں۔ ہم اکثر حدیثیں بیان کرتے ہیں۔ مثلاً ایک جملے کی حدیث ہے اور اگر حضور نے مثلاً بیان کی، ترجمہ کیا، تو بہت سے جملے اس کے ساتھ استعمال کئے جو اس حدیث سے سمجھ میں آتے ہیں۔ مگر الفاظ حدیث میں نہیں ہیں۔ کوئی بحث کرنے والا کہہ سکتا ہے کہ یہ جزو کس چیز کا ترجمہ ہے؟ وہ ایک جملہ ہے۔ آپ نے دس جملوں میں اس کا

ترجمہ بیان کیا۔ تو تحت اللفظی اعتبار سے کوئی ہم سے بحث کرے تو وہ ہماری زبان کیونکر پکڑ سکتا ہے کہ آپ نے کہا کہ ارشادِ رسول ہے۔ تو ارشادِ رسول تو بس اتنا ہے۔ تو آپ نے یہ سب کچھ جو کہہ دیا، یہ کہاں ارشادِ رسول ہے؟

میں کہتا ہوں کہ یہاں روایت نہیں، آیاتِ قرآن میں، جو اس دن کہا تھا، وہ بھی ہمیں معلوم ہے اور اس دن جو یہ مختصر جملہ کہا تھا کہ:

"اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ"۔

"میں وہ جانتا ہوں، جو تم نہیں جانتے"۔

بس اتنا کہنا تھا، خود اس نے بتایا ہے۔ یہ کلام بھی اس نے نقل کیا اور آج فرشتوں سے کہہ رہا ہے کہ کیا میں نہیں کہا تھا:

اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ غَیۡبَ السَّمٰوٰتِ وَ الۡاَرۡضِ ۙ وَ اَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَ مَا کُنۡتُمۡ تَکۡتُمُوۡنَ ﴿۳۳﴾

یعنی اب یہاں جواب میں زور جو لپٹا ہوا تھا، اُسے یہاں اجمال کو تفصیل سے بدل دیا۔ وہاں "وہ" کے لفظ میں جو لپٹا ہوا تھا، اُسے یہاں صاف کر کے کھول کر کہہ دیا۔ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس دن اتنا کہا تھا اور آج کہہ رہا ہے کہ کیا میں نے نہیں کہا تھا کہ میں آسمان و زمین کے غیب بھی جانتا ہوں اور اسے بھی جانتا ہوں جو تم ظاہر کرتے ہو اور اُسے بھی جانتا ہوں جو تم چھپاتے ہو۔

حضورِ والا! تمام اہلِ منبر یہ یاد رکھیں کہ ہمیں اور آپ کو نقل بالمعنی کا حق دے دیا گیا۔

مثال کے طور پر عرض کروں ایک جانی پہچانی حدیثِ قدسی، وہ یہ ہے کہ:

"لَوْلَاكَ لِمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ"۔

خالق کا خطاب ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے ہمارے رسول، تو ہم آسمانوں کو پیدا نہ کرتے۔

اب ہر صاحبِ فہم غور کرے کہ یہاں خاص آسمانوں کی کوئی خصوصیت بیان کرنا ہے کہ آسمان ایک ایسی چیز ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو ہم آسمانوں کو پیدا نہ کرتے۔ تو اب جدید فلسفہ سائنس میں اگر آسمان کچھ ہے نہیں، صرف حدِ نظر ہے تو پھر یہ افلاک ہی قابل بحث ہو گئے کہ "لَوْلَاكَ لِمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ"، کیا معنی؟ مگر یاد رکھئے کہ تصورِ انسانی میں افلاک محیطِ کل ہیں۔ یعنی افلاک سب کو گھیرے ہوئے ہیں۔ تو یہ کہنا کہ اگر آپ نہ ہوتے تو افلاک کو پیدا نہ کرتا، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر آپ نہ ہوتے تو کچھ بھی پیدا نہ ہوتا۔ جو شے سب پر حاوی ہے، اس کا نام لے کر سب کا مطلب ادا کیا۔ اب اصل حدیث اتنی ہے اور میں کسی دن اپنے زورِ بیان میں یہ کہہ دوں کہ خالق نے خطاب کیا کہ آپ نہ ہوتے تو زمین بھی نہ ہوتی، کوہ نہ ہوتے، آفتاب نہ ہوتا۔ آپ نہ ہوتے تو ماہتاب بھی نہ ہوتا، ستارے بھی نہ ہوتے۔ اب کوئی میری زبان پکڑے، مجھ سے مطالبہ کرے کہ یہ کہاں ہے تو میں یہ کہوں گا کہ وہی ہیں جہاں "لَوْلَاكَ لِمَا خَلَقْتُ الْاَفْلَاكَ" ہے۔ وہ اجمال ہے، میں نے اُسے تفصیل سے بدل دیا۔

اب آجائیے اس پر کہ "اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ" کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔ یعنی میں آسمان و زمین کے غیب کو جانتا ہوں۔ جو تم

چھپاتے ہو، وہ بھی جانتا ہوں اور جو تم ظاہر کرتے ہو، وہ بھی جانتا ہوں۔ فرشتہ بیچارہ، وہ معصوم تو خاموش ہے ہی، ارے اس دن بھی خاموش رہا تھا۔ مگر اس دن خاموش رہا تھا ادب سے۔ آج خاموش ہوا ہے سمجھ کے۔ دل کی خلش دور ہوگئی۔ اس طرح سوال کا جواب آج دیا گیا۔ مگر فرشتے خاموش ہوگئے۔ میں ناقص انسان ہوں، میں نہیں خاموش ہوتا۔ میں اب فرشتوں کا وکیل ہوجاتا ہوں۔ فرشتوں کی طرف سے وکالت کرنے لگتا ہوں۔ وہ کیا؟ میرے ذہن میں ابھی خلش ہے۔ میں کہتا ہوں کہ سوالِ ملک میں دونوں پہلو عمل سے متعلق تھے۔ خونریزی اور فساد بھی کردار سے متعلق چیز اور تسبیح و تقدیس بھی کردار سے متعلق چیز۔ یہ امتحانِ آدم میں علمی بلندی ثابت ہوئی تو پھر بالواسطہ نتیجہ نکالیں کہ جس کا علم بلند ہوگا، اس کا عمل بھی بلند ہوگا۔ یہ بہت منطقی ہیر پھیر کا راستہ ہے کہ یہ نتیجہ نکالیں۔ حالانکہ چاہے کتنے مشاہدے ہوں، علمائے بے عمل بھی پھر نظر آتے ہیں ورنہ مذمت کیوں ہوتی حدیثوں میں علمائے بے عمل کی؟

بہرحال میں کہتا ہوں کہ علمی بلندی ثابت ہوئی۔ عمل میں بلندی اب ثابت نہیں ہے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ اتنا جواب تھا، فوراً دے دیا گیا۔ جلدی اُسے ہوتی ہے جسے وقت کے نکلنے کا ڈر ہو اور وہ عالم الغیب، وہ قادرِ مطلق، جو امکانات کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ جسے وقت کے نکلنے کا اندیشہ نہیں۔ میں کہتا ہوں کہ وہ بھی جانتا ہے کہ پورا جواب نہیں ہوا۔ مگر اس میں بھی ہزاروں برس کا انتظار ہوا ہے۔ گویا کہہ رہا ہے کہ ہم سے بھی اگر، ہم میں سمجھ ہو تو آج آدم کے ذریعہ سے ہم نے علم میں بلندی ثابت کردی۔ اب آنے دو ایک فخرِ آدم کو۔ تو اس

وقت، تو سہی جو ملک سے بھی عمل کی منزل میں اقرار لے لیا جائے کہ جو انسان کرسکتا ہے، وہ میں نہیں کرسکتا۔ وہاں تو ہزاروں برس، یہاں بھی ہزاروں برس سہی۔ آنے دو ایک ایسے کو۔ وقت آگیا جب شبِ ہجرت۔ اب یہاں میں نام نہیں لوں گا۔ جو بحث ہے ملک اور انسان کی، وہی کہوں گا۔

وہ وقت آگیا جب شبِ ہجرت ایک انسان، علی کہنے میں وہ لطافت نہیں ہے جو انسان کہنے میں ہے۔ جب شبِ ہجرت ایک انسان جس کا نام علی ہے، ایک انسان رسول بنا ہوا حکمِ خدا سے پیغمبر کے بستر پر لیٹا ہے اور حکم تو تھا لیٹنے کا مگر یہ سو بھی گیا ہے۔ حکم ادھر سے لیٹنے کا ہی ہوسکتا تھا۔ سونے کا حکم ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ شریعت افعالِ اختیاریہ سے ہی متعلق ہوسکتی ہے۔ لیٹنا اپنے بس کی بات ہے، سونا اپنے بس کی بات نہیں ہے۔ لیٹنا ارادی فعل ہے، سونا ارادی فعل نہیں ہے۔ لیٹ جانے کا حکم ہے مگر سو بھی جائے حکم سے، یہ ناممکن ہے۔ یہ سونا تو کیفیتِ نفس سے متعلق ہے۔ اگر نفس مضطرب ہوگا تو نہیں سوئے گا اور نفس اگر مطمئن ہوگا تو سو جائے گا۔

اب مجھ سے کوئی گواہ مانگے، تو میں کہتا ہوں کہ ایسی بات جو بس آدمی خود ہی جانتا ہو، دوسرے کو علم ہی نہ ہوسکے تو اس میں شرعاً بھی خود اس کا قول ہی معتبر ہوتا ہے۔ گواہوں کا مطالبہ اس میں غلط ہے۔ راوی لیٹنا دیکھ سکتا ہے، راوی سونا نہیں دیکھ سکتا۔ لیکن جو لیٹتا ہے، وہ خود بتائے گا کہ جاگ رہا تھا یا سو رہا تھا۔ تو خود اس نے بعد میں بتایا کہ جیسی نیند شبِ ہجرت آئی، ایسی کبھی نہیں آئی۔

ہمیں حیرت ہے کہ کیونکر سو رہے ہیں؟ ہمارے ہاں تو محلے میں کوئی کھٹکا

ہو جائے تو نیند اُڑ جائے، چہ جائیکہ اپنے گھر کے اندر کھنچی ہوئی تلواریں اور لٹکتے ہوئے نیزے اور اس میں ایسی گہری نیند کہ کبھی نہیں سوئے تھے۔ اور وہ جو رات کو کبھی سونے کا عادی نہ ہو، وہ کیونکر سو یا؟ جس کی رات محرابِ عبادت میں گزرتی تھی، یہ آج لٹا دیئے گئے۔ میں کہتا ہوں کہ یہی تو راز ہے سونے کا کہ جس کیلئے روز جاگتا تھا، آج اُسی کیلئے سو رہا ہے۔ بس یہ سو رہے تھے اور جاگنے والا دیکھ رہا تھا۔ اُسے تو کبھی نیند آتی ہی نہیں:

"لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ"۔

وہ دیکھ رہا ہے اور اب دیکھا کہ رئیس الملائکہ، ان میں نسلیں بدلتی نہیں ہیں۔ جو اس وقت تھے، وہی اس وقت ہیں۔ تو ان میں منتخب کیا جو ممتاز ہیں، سید الملائکہ، جبرئیل اور ویسے ہی ممتاز جنابِ میکائیل۔ اب یہ جو عرض کر رہا ہوں، یہ اِدھر اُدھر کی کتابوں کی بات نہیں، حافظ ابو نعیم اصفہانی حلیۃ الاولیاء میں، یہ حافظ وہ حافظِ قرآن نہیں، یہ حافظ علم حدیث کی اصطلاح ہے، جو تیس ہزار، چالیس ہزار، ستر ہزار حدیثیں متن و سند کے ساتھ حفظ رکھتا ہو، اُسے حافظ کہتے ہیں۔

چنانچہ چودہ سو برس کے علماء میں بڑے بڑے علماء ہیں، مگر حفاظ چند ہیں۔ صحاحِ ستہ کے مصنفین حافظ نہیں کہلاتے، جو فقہ میں امام کہلاتے ہیں، وہ حافظ نہیں کہلاتے۔ حافظ صرف چند ہی ہیں۔ ابن حجر دو ہیں، ایک نویں صدی میں ہیں، دسویں صدی تک۔ وہ علامہ ابن حجر مکی، صواعق محرقہ کے مصنف اور ایک ان سے بھی پہلے ابن حجر عسقلانی۔ وہ ساتویں صدی کے آدمی ہیں، حافظ ابن حجر کہلاتے ہیں۔ لوگ دھوکہ کھاتے ہیں، ان کو حافظ ابن حجر کہہ دیتے ہیں۔ تو وہ

ناواقف ہیں تو حافظ ابن حجر عسقلانی ہیں جو اصابہ فی معرفۃ الصحابہ کے مصنف ہیں اورشرح صحیح بخاری کے مصنف ہیں اور بہت کچھ ہیں۔

سب سے آخر میں سیوطی، حافظ جلال الدین سیوطی۔ یہ دسویں صدی کے آخر کے ہیں۔ ان کے بعد سے کوئی حافظ نہیں ہے۔ حافظ سیوطی کو اپنے مطلب کی وجہ سے لوگ گھٹانے لگے ہیں کہ وہ رطب و یابس لکھ دیتے ہیں کیونکہ انہوں نے ہمارے مطلب کی باتیں زیادہ لکھی ہیں۔ لہٰذا دنیا والے کہتے ہیں کہ سیوطی کا کوئی اعتبار نہیں، وہ تو سب کچھ لکھ دیتے ہیں۔ تو جو اپنے مطلب کی باتیں کم لکھے، کسی کے مطلب کی باتیں زیادہ لکھے، وہ گویا یابس سب کچھ لکھنے لگا۔ تو حافظ ان کا امتیازِ خاص ہے۔

تو اب یہ حافظ نعیم اصفہانی اور دوسرے شیخ مشائخ صوفیاء بھی ہیں اور علماء میں بھی بڑا درجہ رکھتے ہیں۔ امام غزالی، ان کے نام کے ساتھ امام ہے، حافظ بھی ہیں۔ ہمارے ہاں تو یہ لفظ وسیع ہو گیا ہے۔ مگر علمائے اسلام کی اصطلاح کے مطابق یہ ایک ہیں غزالی جن کا لقب حجۃ الاسلام ہے۔ ابو حامد غزالی اور حافظ ابو نعیم کی لکھی ہوئی بات ہے جو عرض کر رہا ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان کی بات بغیر پیغمبر کے بتائے ہوئے کسی تک نہیں پہنچ سکتی۔ چاہے بطورِ سند درج نہ کیا ہو مگر یقیناً وہیں سے چلی ہوئی بات ہے جو ان تک پہنچی۔

تو وہ لکھتے ہیں کہ اس موقع پر جب علیؑ رسولؐ کے بستر پر آرام کر رہے تھے تو خالق مخاطب ہوا، جبرئیل ومیکائیل کی طرف کہ جبرئیل ومیکائیل! میں نے تم دونوں کو ایک دوسرے کا بھائی بنا دیا اور تم میں سے ایک کی عمر دوسرے سے

زیادہ قرار دی۔ ماشاء اللہ اہل فہم ہیں، میں کہتا ہوں، یہ بتادیا بس کہ ایک کی عمر زیادہ۔ یہ نہیں بتایا کہ کس کی عمر زیادہ؟ کیونکہ پھر پوچھ رہا ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اپنی فاضل عمر کا حصہ دوسرے بھائی کو دے دے؟

اُس دن ملک نے سوال کیا تھا، خبر نہیں دی تھی۔ میں نے کہا تھا کہ خبر دیتا تو صحیح ہی بات ہوتی۔ جھوٹی خبر ملک نہیں دے سکتا۔ سوال کیا تھا جس میں سچ اور جھوٹ کا سوال نہیں۔ آج خالق حکم دے رہا ہے کہ دے دو۔ ورنہ پھر عصمتِ ملک اطاعت کروائے گی، حکم نہیں دیتا، سوال کرتا ہے کہ تم میں سے ایک کی عمر زیادہ ہے، ایک کی کم ہے۔ تم میں سے کون ہے جو اپنی فاضل عمر کا حصہ اپنے دوسرے بھائی کو دے دے؟ اگر بتادے کہ کس کی عمر زیادہ ہے تو امتحان ایک ہی کا ہوگا لیکن جب پردے میں رکھا تو اب جواب ہر ایک کو دینا چاہئے جس کی عمر زیادہ ہو، وہ کہے کہ ہاں۔ تو ہر ایک کو بولنا چاہئے۔ یہ بھی کہے کہ ہاں، وہ بھی کہے کہ ہاں۔ ہر ایک کہے کہ جس کی عمر زیادہ ہے، وہ دینے کیلئے تیار ہے۔ حکم نہیں دیا جارہا۔ فقط پوچھا جارہا ہے۔ تو ملک معصومانہ جواب دیتا ہے کہ بارِ الٰہا! ہماری تو اصل تمنا یہ ہے کہ پوری عمر تیری عبادت میں صرف ہو۔

اس میں ایک بڑی حقیقت مضمر ہے کہ ملک کا تصور عبادتِ انفرادی و شخصی ہے۔ وہ بس نماز پڑھنے کو عبادت سمجھتا ہے۔ اسی کو فخر میں بھی پیش کیا تھا کہ ہم تیری تسبیح و تقدیس کرتے ہیں۔ بس یادِ الٰہی میں مصروف۔

امیر المومنین علیہ السلام نے بھی تعریف کی ہے۔ کچھ رکوع میں ہیں جو سیدھے نہیں ہوتے، کچھ سجدے میں ہیں۔ تو بس ان کی عبادت شخصی ہے، انفرادی ہے،

اکیلی اکیلی عبادت ہے۔ اجتماعی عبادت کہ دوسرے کے کام آنا بھی عبادت ہے،
یہ حدودِ تصورِ ملک سے بھی خارج ہے ورنہ اس سوال کا جواب سے جوڑ نہیں۔ وہ
کہتا ہے کہ تم میں سے کون ہے جو اپنی عمر کا فاضل حصہ دے دے؟ یہ کہتے ہیں کہ
ہماری تمنا تو یہ ہے کہ ساری عمر تیری عبادت میں صرف کریں۔ یہ جواب سوال
سے مرتبط اسی بناء پر ہے۔ اس میں یہ مضمر ہے کہ ہم تو پوری زندگی تیری عبادت
میں صرف کرتے ہیں، اگر فاضل عمر کا حصہ دوسرے کو دے دیں تو اتنی سے محروم
ہو جائیں۔ اب جس کی جتنی عمر ہے، وہ تیری عبادت میں صرف کرے اور اگر اپنی
فاضل عمر کا حصہ دوسرے کو دے دیں تو اپنے حصہ کی عبادت اپنے ہاتھ سے
کھوئیں۔ یہ ہمارے بس کی بات نہیں ہے۔ جواب ہو گیا کہ ہم یہ نہیں کر سکتے۔

اب ارشاد ہوتا ہے کہ زمین کی طرف دیکھو۔ تبصرے میرے ہیں،
اصل واقعہ پورا ان دونوں کتابوں میں ہے۔ زمین کی طرف دیکھو۔ میں کہتا ہوں
کہ زمین کی طرف دیکھو تو وہی بہت دفعہ دیکھا ہوا انسان نظر آیا۔ مگر کبھی دیکھتے
تھے، اس وقت کھڑے ہوئے مگر اس وقت دیکھا تو لیٹے ہوئے۔ کبھی دیکھتے تھے
جاگتے ہوئے آج دیکھا تو سوتے ہوئے دیکھ لیا۔ ارشادِ قدرت ہوا:

"هَلْ لَا كُنْتُمْ مِثْلَ عَلِيِّ ابْنِ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَدْ فَدَا اَخَاهُ بِنَفْسِه"۔

کیوں نہ ہوئے تم مثلِ علی کے جس نے اپنی جان اپنے بھائی پر فدا
کر دی ہے۔

ملک سمجھا کہ یہ عبادت ایسی ہے کہ میری عبادتوں کے معیار سے اونچی

ہے۔ یہ نوعِ عبادت میری تمام عبادتوں سے بالاتر ہے۔تو میں نے کہا کہ یہ کم عقلی کی تھی کہ تسبیح وتقدیس کوفخر یہ پیش کیا تھا۔ دوسرا رُخ دیکھئے کہ اس نے پیش کیا تھا انسان کی زندگی کا تاریک رُخ کہ یہ انسان خونریزی کرتا ہے یعنی جانیں لیتا ہے۔آج قدرت دکھارہی ہے کہ تم نے جان کا لینا دیکھا، جان کا دینا نہیں دیکھا۔

معلوم ہوگیا اور واقعات آپ کے سامنے ہیں، صرف اشارہ کردینا کافی ہے کہ آج سے مستقل طور پر تصورِ ملک میں ترمیم ہوگئی۔یعنی ملک سمجھ گیا کہ دوسروں کے کام آنا بھی، وہ اسی قابل ہوں کہ ان کے کام آیا جائے۔ ملک نے سمجھ لیا کہ دوسروں کے کام آنا بھی عبادت ہے اور میری عبادتوں سے بالاتر ہے۔لہٰذا اب جو کہا جائے گا کہ درزی بن کر جاؤ تو چلا جائے گا۔ اب کوئی ایک ہی واقعہ نہیں ہے۔ درزی بن کر کہا تو چلا جائے گا۔ وضو کیلئے پانی لے کر چلا جائے گا اور لڑائی میں تلوار لے کر مدد کرنے چلا جائے گا۔ اب کبھی نہیں کہے گا کہ یہ سب کروں اور عبادت نہ کروں؟

تو مستقل طور پر تصورِ ملک میں ترمیم ہوگئی۔ اب معلوم ہوگیا کہ عمل میں بھی انسان وہ کرسکتا ہے جو میں نہیں کرسکتا۔ اب ارشادِ قدرت ہوا:

اچھا! تو اب جاؤ اور اس انسان کی حفاظت کرو۔ ارے فقط ان کی حفاظت نہیں ہے۔ اس کی سنت یہ نہیں ہے کہ انبیاء ومعصومین کو حربوں کی زد سے پرے ہٹایا جائے۔ نہیں، گویا وہ کہہ رہا ہے کہ ابھی میرے کچھ کام اس کی اس زندگی سے، میرے ابھی بہت کام ہیں جو ابھی مجھے اس سے لینے ہیں۔ لہٰذا جاؤ اور اس کی حفاظت کرو۔ اب وہ دونوں فرشتے آئے اور اُترے۔ بس واقعہ بعد

میں بیان کروں گا۔ بس ایک غلط فہمی کا دفعیہ۔ ان کو جو بھیجا جا رہا ہے، تو کیا (معاذ اللہ) سزا کے طور پر بھیجا جا رہا ہے؟ میں سزا کا محل اس لئے نہیں سمجھتا ہوں کہ اس وقت مقامِ معرفت میں ملک کچھ اور اونچا ہو چکا ہے۔ مقامِ علم میں اس کی بلندی ہوگئی تو سزا کس چیز کی دی جائے؟ یہ سزا نہیں ہے۔ ایک بڑی حقیقت ہے جسے دو جملوں میں مَیں کہوں گا اور آگے بڑھوں گا۔ میں کہوں گا کہ یہ نہ سمجھئے کہ جو شے اِدھر سے اُدھر جاتی ہے، اس کی معراج ہوتی ہے۔ جب وہاں والوں کو معراج ہوتی ہے تو یہاں بھیج دیا جاتا ہے۔

اب ایک فرشتہ سرہانے اور ایک پائین پا۔ آج یہ بھی ثابت ہو گیا کہ ان کا پیر بھی اتنا ہی اونچا ہے جتنا سر اونچا ہے۔ ایک ملک سرہانے اور ایک پائین پا۔ اب زبان پر کیا ہے؟ کئی الفاظ مجھے معلوم ہیں۔ "بَخٍ بَخٍ لَكَ"۔ یاد رکھئے لفظوں سے کچھ نہیں ہوتا۔ کہنے والے کو دیکھنا ہے:

"بَخٍ بَخٍ لَكَ۔ مَنْ مِثْلُكَ يَابْنَ اَبِيْ طَالِبٍ فَقَدْ بَاهَ بِكَ اللّٰهُ مَلٰٓئِكَةَ السَّمَآءِ"

مبارک ہو، مبارک ہو اے ابو طالب کے فرزند کہ آپ کے ذریعہ سے اللہ فرشتہ ہائے آسمان پر فخر کر رہا ہے۔

بس روایت یہاں ختم ہوئی۔ میں کہتا ہوں "من مثلك"، دیکھئے کون ہے آپ کی مثل کلام کے حدود، حدود متکلم سے بدلتے ہیں۔ اگر انسان کوئی کہے کہ کون آپ کی مثل ہے تو اس کے یہ معنی ہوں گے کہ انسانوں ہی میں کوئی آپ کی مثل نہیں مگر غیر نوع کا ہر فرد یعنی ملک کہہ رہا ہے کون آپ کی مثل۔ اس کے

معنی یہ ہیں کہ مخلوقِ الٰہی کی کسی نوع میں، نہ انسانوں میں ، نہ جنات میں ، نہ فرشتوں میں، کسی نوع میں ان کا مثل نہیں ہے۔ اگر ہے تو ان سے بالاتر وہ ہے کہ جس پر فدا ہو کر یہ مرتبہ مل رہا ہے۔

اب ایک پہلو پر روشنی ڈالوں گا کہ اتنی بڑی تعریف کہ کسی نوعِ مخلوق میں آپ کا مثل نہیں۔مگر اتنی بڑی تعریف میں، نہ ملک ان کا کوئی لقب کہہ سکتا ہے جو القاب ہمیں معلوم ہیں، تو کیا وہ ملائکہ کو نہیں معلوم؟ نہ ان کا کوئی وصف کہتا ہے، نہ ان کا رسول سے کوئی رشتہ بتا تا ہے؟ ارے نہ کہے کچھ اور ان کا نام ہی لے دے کہ ان کا نام علو کا پتہ دیتا ہے۔ بلندی تو ان کے نام میں مضمر ہے مگر ملک یہ کچھ نہیں کہتا۔ وہ تو کہتا ہے: یابن ابی طالب ۔کون آپ کا مثل ہے؟ اے ابو طالب کے بیٹے ! قرآن میں کہا جا رہا ہے:

"لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ"۔

اور یہ قول ہی ہے، تو میں سمجھتا ہوں کہ یہ انتخاب بھی ملک کا طبع زاد نہیں ہے۔ وہ اُدھر سے ہی القا ہے الفاظ کا۔ جو کچھ وہ کہہ رہا ہے، تو یہ کیا بات؟ فصاحت و بلاغت کسی زبان کی ملک نہیں ہے۔ چاہے آپ پنجابی ہوں، چاہے ہندوستانی۔ زبان مادری ہو۔ مقامِ مدح میں کوئی نسبت ایسی جو ذم کا پہلو رکھتی ہو، یہ بلاغت کے خلاف ہے۔تو اتنی اونچی تعریف اور اس میں یہ کہنا کہ اے ابو طالب کے بیٹے!

ماننا پڑے گا کہ ابو طالب کوئی ایسا بڑا باپ ہے جس کی طرف نسبت اس جلالتِ مدح کے خلاف نہیں ہے۔

میری عادت کچھ یہ ہے کہ میں اپنے لئے مشکلات پیدا کرتا ہوں۔ میرے ذہن میں بھی ایک خلش ہے، وہ یہ کہ یہ ثابت ہوا کہ ہاں غلط نہیں، مگر ضرورت کیا تھی؟ ایک تو کھلی ہوئی بات یہ ہے کہ غلط فہمی دور کرنے کا یہی ذریعہ تھا۔ایک طبقے کی غلط فہمی دور کی جائے۔مگراس کے علاوہ؟ آخرضرورت کیا تھی؟ تو جناب! جواس کا جواب مجھے تاریخ سے ملا، وہ شعب ابی طالب کا چار برس کا محاصرہ تھا۔ اس میں ہر رات یہ خطرہ تھا کہ کہیں دشمن شب خون نہ مارے اور چراغِ عمرِ رسالت کو خاموش نہ کردے۔تو ابو طالب نے حفاظتِ رسول کا یہ انتظام کیا تھا کہ رسول کو ایک بستر پرنہیں رہنے دیتے تھے۔کبھی طالب کو رسول کے بستر پر، کبھی رسول کو طالب کے بستر پر۔کبھی جعفر کو رسول کے بستر پر، کبھی رسول کو جعفر کے بستر پر۔کبھی عقیل کو رسول کے بستر پر، کبھی رسول کو عقیل کے بستر پراور کبھی علی کو رسول کے بستر پر، کبھی رسول کو علی کے بستر پر۔

آپ اس قربانی کا اندازہ کرسکتے ہیں کہ چاہے جو بھی بیٹا میرا قتل ہو جائے کسی ایک کو بھی تو مستثنیٰ نہیں کرتے۔ چاہے میرا جو بھی بیٹا قتل ہوجائے مگر رسول کی زندگی محفوظ رہے۔اب میرے ذہن نے یہ فیصلہ کیا کہ ابو طالب کا بیٹا کہنے میں کیا راز ہے! قربانی کا یہ طریقہ، یہ باپ کی ڈالی ہوئی عادت تھی۔ اس کے بعد یہ حق شناس ملک تھا جس نے اس محل پر ابو طالب کو یاد کرنا ضروری سمجھا اور یہ ناحق شناس انسان تھے کہ جنہوں نے اس کے بعد بھی ابو طالب کے ایمان میں شک کیا۔

اب جناب! پورا تبصرہ ہوگیا۔مگر پھر میں نے اپنے لئے ایک مشکل پیدا

کرلی۔ وہ یہ کہ میرا بیان بالکل بے قیمت، اگر کوئی ایک لفظ مجھے قرآن کا مجھے شاہد نہ ملا ہو۔ اسی لئے تو میں نے کہاں کا کہاں سے ربط ملایا ہے اور کہاں یہ بعثت خاتم الانبیاء کے بعد یہ ہجرت کی رات۔ تو یہ ربط کیا میں نے از خود ملا دیا؟ تو یہ تو بہت بڑی جرأت کی بات ہے۔ اس میں تو کوئی وزن نہیں ہے۔ جب تک کہ کوئی لفظ قرآن کا شاہد نہ ہو، وہ آیت جو اس کارنامہ علی پر مہر تصدیق ثبت کرتی ہوئی آئی:

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ یَّشْرِیْ نَفْسَهُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ط وَاللّٰهُ رَءُوْفٌ بِالْعِبَادِ ﴿۲۰۷﴾

اس آیت میں بھی اللہ نے نہ ان کا کوئی لقب کہا ہے، نہ ان کا کوئی وصف کہا ہے، نہ ان کا رسول سے کوئی رشتہ کہا ہے، نہ ان کا نام لیا ہے بلکہ بس ان کے کردار کو پیش کرکے، سرنامہ خطاب یہ ہے، سرنامہ مدح یہ ہے "**ومن الناس**"، انسانوں میں دیکھو، یہ ایک شخص ہے جو اپنی جان کو رضائے الٰہی کیلئے دیتا ہے۔ یہ اس سند میں انسان کہنے کی کیا ضرورت تھی؟ وہ یہی ضرورت تھی کہ آج علی نوعِ انسان کا نمائندہ بنے ہوئے نوعِ ملک پر اس کی بلندی کو ثابت کررہے ہیں۔ اس لئے اس دستاویز میں انسان کہا گیا۔ ہاں! اس کے بعد عام طریقہ قرآن کا یہ ہے کہ فرد کی مدح ہوتی ہے مگر جمع کے صیغہ میں یہاں تک کہ آیۂ ولایت میں بھی سب جمع کے صیغے ہیں:

اِنَّمَا وَلِیُّكُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوا الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَیُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَهُمْ رٰكِعُوْنَ ﴿۵۵﴾

مدح فرد کی اور الفاظ جمع کے۔مگر یہاں خالق نے وحدت نمایاں کی ہے۔ "وَمِنَ النَّاسِ"، انسانوں میں ایسے بھی ہیں "مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ"، دیکھو! انسانوں میں یہ ایک ایسا ہے۔اب اس منزلِ قربانی میں کوئی کہیں نہیں ہے۔"مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ"، اہل علم جانتے ہیں "مِن" میں گنجائش واحد و جمع دونوں کی ہے۔مگر نہیں، فعل جو لائے گئے ہیں، وہ سب واحد "مِنَ النَّاسِ مَنۡ یَّشۡرِیۡ"، انسانوں میں وہ ہے جو بیچ ڈالتا ہے۔ بیچ ڈالتے ہیں نہیں، "نَفۡسَهُ"، واحد کی ضمیر، نفس بھی واحد، "اَنۡفُسَهُمۡ" نہیں، اپنے نفوس کو۔حالانکہ مباہلہ میں ایک نفس لایا جائے گا۔مگر "اَنۡفُسَنَا" کہا گیا ہے۔عام سنتِ الٰہی یہی ہے کہ واحد کی مدح جمع کے صیغے سے کرتا ہے۔

مگر یہاں وحدت نمایاں ہے کہ دیکھو کہ یہ بھی ایک ہے جو اپنی جان کو بیچتا ہے۔بس مدح میں کہتا ہوں، اب میں کیا کروں کہ اس کے بعد وحی کا دروازہ بند ہو گیا۔اس کے بعد کوئی قرآن کی آیت اُترتی ہوئی نہیں دکھا سکتا۔مگر واقعہ یہ ہے کہ اگر دس محرم ۶۱ ھ کو کوئی آیت اُترتی تو یہ وحدت جمع کی شکل اختیار کرتی اور آج فرشتے دیکھتے کہ ہاں! ایک جماعت ہے جو ایسا کچھ کرتی ہے کہ ہم نہیں کر سکتے۔اس وقت جمع کی شکل ہوتی کہ دیکھو! ایسے بھی انسان ہوتے ہیں۔کوئی یہاں کہہ سکتا ہے کہ یہ تو بہت حد سے بڑھی ہوئی بات ہے۔کہاں حضرت علی علیہ السلام اور کہاں یہ پورا مجمع؟ یہ پوری جمعیت۔کہا جا رہا ہے کہ ان کیلئے کہا جاتا۔

مگر میں کہتا ہوں، وہ پوری جمعیت جس میں جتنا فرق ہے، وہ مجھے معلوم ہے۔عصر تک کے جہاد میں اصطلاحی طور پر معصوم۔تو بس ایک ذات ہے عصر تک

کے جہاد میں۔ معصوم اصطلاحی ایک ذات، اس کے بعد سب عرب ہی نہیں، ان میں حبشی بھی ہیں، ترکی بھی ہیں۔ تو سب عرب بھی نہیں ۔ ارے سب آزاد بھی نہیں، ان میں غلام بھی ہیں۔ تو اپنی جگہ تو جو فرق ہے، مجھے معلوم ہے اور زمین آسمان کا فرق ہے۔ مگر جہاں تک کردارِ کربلا کا تعلق ہے، مجھے کوئی اور فرق کیا، مجھے اس کردار میں معصوم اور غیر معصوم کا فرق بھی نظر نہیں آتا۔ اگر کردار کی منزل میں کوئی فرق ہوتا تو حجتِ خدا سب کو مخاطب کر کے نہ کہتے کہ:

بِأَبِي أَنْتَ وَأُمِّي يَا أَصْحَابَ الْحُسَيْنِ طِبْتُمْ وَطَابَتِ الْأَرْضِ الَّتِي دُفِنْتُمْ فِيهَا۔

معصوم ابن معصوم، حجتِ خدا ابن حجتِ خدا، وہ کہہ رہے ہیں میرے ماں باپ تم پر قربان ہوں، اے مجاہدین کربلا! تم بھی پاک ہوئے اور وہ زمین بھی پاک ہوئی جہاں تم دفن ہوئے اور کاش! میں تمہارے ساتھ ہوتا اور اس عظیم کامیابی میں شریک ہوتا۔

مصائب

پس جناب! کل عرض کر چکا ہوں کہ ہمارے رونے پر طرح طرح کے سوال ہوتے ہیں، ہماری عزا پر طرح طرح کے اعتراض ہوتے ہیں۔ ایک سوال کل پیش کیا تھا، اب ایک اور سوال جو بہت ہوتا ہے۔

ہر قسم سے، ہر ڈھب سے تماشہ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے تو کہا جاتا ہے کہ رونا تو بزدلی ہے، عورتوں کا کام ہے۔ مرد اور بہادر لوگ تو نہیں روتے۔

انہوں نے روکر قوم کو بزدل بنا دیا۔ اتفاق سے ایک بات مجھے یاد آگئی، معلوم نہیں کہاں سے چلی ہے، اتفاق سے اس لفظ کو شروع شروع میں استعمال کرنے والے بھی ایک ایرانی تھے، جلال الدین، ان کا رسالہ "حبل المتین" کلکتہ سے نکلتا تھا، وہ اصطلاحی طور پر کہتے ہیں کہ مجلسوں میں فقط گریہ کو نصب العین نہیں بنانا چاہئے، تو اس کے ذیل میں انہوں نے کہا تھا کہ ہماری قوم تو ملتِ گریہ کن ہے، کبھی طنز سے کہا جاتا ہے: "ملتِ گریہ کن"۔ یہ سب سے پہلے ان ایرانی جلال الدین، ایڈیٹر حبل المتین نے لکھا تھا۔ میں کہتا ہوں کہ کیا قدرت کی کارفرمائی ہے کہ ایک ایرانی فرد کا جواب ایرانی قوم نے اپنے عمل سے دیا کہ دیکھو! جو ملت گریہ کن ہے، وہ یہ کرتی ہے۔ یہ کہا جاتا ہے کہ رونا تو بزدلی ہے، یہ کیا گریہ کا عمل، اتنی کوشش، یہ پورا ہر سال گویا گریہ کی فراوانی، تو میں کہتا ہوں کہ گریہ کا پس منظر اسی جملے میں ہے۔ ہمیں سکھایا گیا ہے کہ واقعہ کربلا کو یاد کرو تو کہو:

"يَالَيْتَنِیْ كُنْتُ مَعَكُمْ فَاَفُوْزُ فَوْزًا عَظِيْمًا"۔

"کاش! میں آپ لوگوں کے ساتھ ہوتا اور اس عظیم کامیابی کو حاصل کرتا"۔

یہ شخص جو کہہ رہا ہے کہ رونا بزدلی ہے، اب میں اس سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہوں گا کہ سمجھ کر کہو کہ کسی معرکہ میں ہو کر رونا بزدلی ہے اور کسی معرکے میں شریک نہ ہونے پر رونا عین شجاعت ہی ہے؟

بخدا! اگر ہم زیرِ رایت ابوالفضل العباس علیہ السلام ہوتے تو نہ روتے، کربلا میں کون روتا ہوا دنیا سے گیا؟ حبیب ابن مظاہر روتے ہوئے گئے؟ مسلم ابن

عوسجہ روتے ہوئے گئے؟ قاسمؑ اس وقت تک روئے جب تک اجازت نہ ملی، جب اجازت مل گئی تو ہشاش بشاش چہرے کے ساتھ گئے۔ عباسؑ کیا روتے ہوئے گئے؟ علیؑ اکبر روتے ہوئے گئے؟ ارے کربلا میں تو بے شیر بھی ہنس کر گیا۔ کربلا میں جو تھے، وہ روتے ہوئے نہیں گئے، دہرانا میری عادت نہیں مگر مقصد دہرا رہا ہوں کہ عباسؑ نہیں روئے، علیؑ اکبر نہیں روئے، قاسمؑ روتے ہوئے نہیں گئے۔

حسینؑ بھی جب تک دوسرے جا رہے تھے، نہیں روئے، جب خود میدان میں گئے تو نہیں، ہاں! اگر روئے تو مخدراتِ عصمت کی مظلومیت پر روئے ہیں یا اپنے بچھڑنے والوں کی یاد میں روئے ہیں۔ آپ اس لئے قطعی طور پر نہیں روئے کہ وہ شہید ہونے کیلئے میدان میں آئے ہیں بلکہ آپ کو اپنی، اپنے عزیزوں اور ساتھیوں کی غریبی اور مظلومیت رُلا رہی تھی۔ آپ اپنے پردہ داروں کی اسیری اور مظلومیت کو یاد کر کے رو رہے تھے۔ لیکن امام حسین علیہ السلام کی شہادت کے بعد امام زین العابدین علیہ السلام عمر بھر روتے رہے۔ اب رونے کا مطلب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ سید سجاد علیہ السلام خون کے آنسو کیوں روتے تھے؟

"اَجْرُ کُمْ عَلَی اللہ"۔

مجلس ختم ہوگئی، اب ایک سوال اور اُس کا جواب، ارے چودہ سو سال گزر گئے اور اب تک آپ لوگ رو رہے ہیں، میں کہتا ہوں کہ جنہیں بروقت رونے کا حق تھا، اگر اُنہیں رو لینے دیا ہوتا تو شاید ہم آج تک نہ روتے۔

مجلسِ دوم

✪ شہادت کی دو اقسام ہیں ،ایک شہادت سرّی اورایک شہادت جہری۔مخفی شہادت زہر سے ہوتی ہے اوراعلانیہ شہادت تلوار سے ہوتی ہے۔دونوں شہادتیں دونوں نواسوں پر تقسیم ہو گئیں۔

✪ دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں، جھکائے نہیں جاتے۔ یہ کس لئے؟ حضرت موسیٰؑ کلام کرنے طور کی بلندی پر جاتے تھے، زمین کے کسی غار میں نہیں جاتے تھے۔کبھی آپ لوگوں نے سوچا کہ اس کی وجہ کیا ہے؟

✪ عرش اس کا پایۂ تخت ہے مگر زمین اس کی ربوبیت سے خارج نہیں ہے۔اسی طرح زمین اس کا پایۂ تخت ہے مگر عالم بالا اس کی رسالت سے باہر نہیں ہے۔لہٰذا جہاں بھی جائے گا، نماز یں پڑھا تا ہوا جائے گا، اقتداء کرتا ہوا نہیں جائے گا، امامت کرتا ہوا جائے گا۔

✪ میں کہتا ہوں کہ یہ کہا تھا کہ تمہارے جیسا بشر ہوں ، یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارے ہی جیسا ہوں ۔ یہ کہا تھا کہ تمہاری طرح بشر ہوں، یہ نہیں کہا تھا کہ تمہاری طرح خطا کار ہوں۔

✪ جنابِ رسولؐ خدا جتنا حسینؑ کے غم میں روئے ، اتنا کبھی اورکسی کیلئے نہیں روئے ، یہاں تک کہ کربلا والوں کے غم میں جتنا آپؐ روئے ، اتنا کوئی نہیں رویا۔

خلافتِ الٰہیہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاِذۡ قَالَ رَبُّکَ لِلۡمَلٰٓئِکَۃِ اِنِّیۡ جَاعِلٌ فِی الۡاَرۡضِ خَلِیۡفَۃً ؕ قَالُوۡۤا اَتَجۡعَلُ فِیۡہَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡہَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ ۚ وَنَحۡنُ نُسَبِّحُ بِحَمۡدِکَ وَنُقَدِّسُ لَکَ ؕ قَالَ اِنِّیۡۤ اَعۡلَمُ مَا لَا تَعۡلَمُوۡنَ ﴿۳۰﴾

(تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں اپنا ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔ تو انہوں نے کہا کہ کیا تو انہیں مقرر کرے گا جو اس میں فساد پیدا کریں اور خونریزی کریں، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔)

سورۂ الحمد کے بعد پہلے ہی سورہ میں اور قرآن مجید کے بڑے اور وسیع تر سورہ میں پہلے ہی رکوع میں یہ آیت ہے کہ وہ موقع آیا جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا کہ میں زمین میں ایک جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔ انہوں نے کہا کہ کیا اس زمین میں ان کو مقرر کیا جائے گا جو اس میں فساد کریں اور خونریزی کریں، حالانکہ ہم تیری تسبیح و تحلیل کرتے ہیں اور پاکیزگی

کے ساتھ تجھے یاد کرتے ہیں۔ ادھر سے ارشاد ہوا کہ جو میں جانتا ہوں، وہ تم نہیں جانتے۔ وہ موقع یاد رکھنے کا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن مجید نے سابقہ واقعات صرف تفریحِ طبع کیلئے بیان نہیں کئے ہیں بلکہ اس لئے کہ اس میں اُمت کیلئے کچھ بصیرتیں موجود ہیں اور ان کی کچھ اہمیت ہے۔

جو میں نے عرض کیا کہ یہ موقع یاد رکھئے گا۔ اب اس کا آغاز اس سے ہوتا ہے کہ تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے یہ کہا۔ کیا کہا؟ اب آنے والا ابھی ہم بتا بھی نہیں سکتے کہ کتنی مدت کے بعد آئے گا۔ چاہے سو برس ہیں، چاہے ہزار برس ہیں، اس کا بیان قرآن مجید میں بھی نہیں ہے، احادیث میں بھی نہیں ہے۔ بہرحال بہت پہلے سے کہا جا رہا ہے کہ میں زمین میں ایک جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ اب چونکہ قرآن مجید میں یہ ہے کہ جانشین، مگر کس سے تعلق ہے اس جانشینی کا؟ اس کا کوئی ذکر نہیں۔ لہٰذا عام مفسرین اس میں پریشان ہو گئے ہیں۔ اس میں کہ جانشین بنانے والا ہوں۔ تو کسی کا جانشین؟ اب میں کہتا ہوں کہ دشواری کیا ہے؟ قرآن تو سامنے ہے، کافی ہے۔ مگر ذرا سی بات کے سمجھانے کیلئے کافی نہیں ہوتا۔ اب اُلجھے ہوئے ہیں کہ جانشین کس کا؟ تو کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔ بہت دور کی کوڑی لائے۔ اب وہی تاریخ وغیرہ سے، روایات سے۔ ورنہ اس وقت انہوں نے کہاں دیکھا تھا؟ تو یہ کہا کہ آدمی یعنی انسانی نسل سے پہلے اس زمین پر جنات و شیاطین آباد تھے جن کو عربی میں جن و نسناس کہتے ہیں۔ آدمی ناس ہیں اور وہ نسناس۔ تو جنات و نسناس یعنی جنات و شیاطین۔ یہ قوم اس دنیا میں بسی ہوئی تھی۔ اس کے بعد بداعمالیوں سے وہ تباہ و برباد کئے گئے۔ تو اب خالق کا

مطلب یہ ہے کہ میں ان کی جگہ، ان شیطانوں کی جگہ پر، جنات کی جگہ پر ایک مخلوق کو پیدا کرنا چاہتا ہوں۔ بڑے بڑے علماء غور وفکر کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ۔میں کہتا ہوں کہ فکر ہر کس بقدرِ ہمت اوست۔ ارے صاحب! بات یہاں پر ختم نہیں ہوئی، اس کے بعد فرشتے کہہ رہے ہیں کہ ہم تیری تسبیح کرتے ہیں، یعنی کسی اور کی کیا ضرورت ہے؟ ہم ہی کو کیوں نہیں مقرر کیا جاتا؟

توسبحان اللہ! جنات وشیاطین کی جانشینی اور ملائکہ کا رشک کرنا۔ ملائکہ کو اس کی تمنا پیدا ہوئی کہ جنات و شیاطین کی جگہ پر ہم کو رکھ دیا جائے ۔تو ہر صاحبِ عقل سمجھ سکتا ہے کہ یہ بات دل کو نہیں لگتی۔ فرشتے، جوارِ اقدس میں بسنے والے، عالمِ بالا کے رہنے والے اور وہ اس کے قرب وجوار میں رہنے کی بجائے یہ طلب کریں کہ ہمیں شیطانوں کی جگہ اس دنیا میں بھیج دے۔ یہ خلافِ عقل ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس کا فیصلہ ہر زبان کے محاورے سے ہوسکتا ہے۔ کوئی صاحب آپ میں سے دوپہر کے وقت کہیں گئے ہوئے تھے، وہاں سے کسی دوست کے ہاں آئے اور کہا کہ ارے بھئی! بہت پیاس لگی ہے۔ تو وہ دوست پوچھے گا کہ کس کو پیاس لگی ہے؟ ارے صاحب! کسی اور کو پیاس ہوتی تو اُس کا نام لیا جاتا۔ جب اس کا نام نہیں لیا گیا تو سمجھ لیجئے کہ جو کہہ رہا ہے، اُسی کو پیاس لگی ہے۔

کوئی اور زیادہ بے تکلف دوست ہو اور کہے کہ بہت بھوک لگی ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مجھ کو بھوک لگی ہے اور مثلاً والد ماجد فرماتے تھے، کیا کوئی پوچھے گا، کس کے والد ماجد؟ کسی اور کے والد ماجد کا ذکر ہوتا تو اس کا نام ہوتا۔ جب کسی اور کی طرف اضافت نہیں دی تو سمجھئے کہ جو کہہ رہا ہے، وہ اپنے ہی والد کی

بات کرر ہا ہے۔ بھائی صاحب سفر سے آ گئے ہیں، کہیں گئے ہوئے تھے۔کس کے بھائی صاحب؟ معلوم ہوتا ہے کہ جب کسی اور کا ذکر ہوتو متعلق کیلئے اظہار کی ضرورت ہوتی ہے اور جب خود متکلم اپنی طرف اضافت دینا چاہے تو پھر کسی متعلق کے ذکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔کوئی کہے کہ پیاس لگی ہے،کوئی نہیں پوچھے گا کہ کس کو؟ کہے بھوک لگی ہے تو کوئی نہیں پوچھے گا، کس کو؟ کہے کہ والد صاحب نے کہا تھا، وہ نہیں پوچھے گا، کس کے؟ بھائی صاحب نے کہا ہے، نہیں پوچھے گا، کس کے؟

اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میں جانشین مقرر کرنے والا ہوں۔تو دنیا پوچھتی ہے کہ کس کا؟ ارے صاحب! جب نہیں بتایا کہ کس کا تو سمجھ لیجئے کہ جو کہہ رہا ہے، وہ اپنی ہی طرف اضافت دینا چاہتا ہے کہ میں زمین میں اپنا جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔تو خدا اپنا جانشین کیوں بناتا ہے؟ ہماری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ جانشین وہ بنائے جس سے مکان یا زمان خالی ہو۔مکان خالی ہو یعنی ایک جگہ سے دوسری جگہ جائے تو جانشین بنائے۔ یا زمانہ اس سے خالی ہو تو جانشین بنائے اور ذاتِ الٰہی جو زوال وانتقال سے بری ہو تو اس کی طرف سے جانشین بنانے کے کیا معنی؟ اس کو میں دو رُخوں سے سمجھاؤں گا۔ایک رُخ تو بہت کھلا ہوا ہے جس میں زیادہ غور کی ضرورت نہیں ہے، نہ علمیت کی اس میں کوئی ضرورت ہے۔اس میں ایک ذراسی گہرائی ہے۔مگر ماشاء اللہ ہمارا مجمع بافہم ہے تو کوئی گہرائی محسوس نہیں ہوگی۔

تو پہلا حل یہ ہے کہ بے شک خالق کی طرف زمین وآسمان دونوں کی نسبت یکساں ہے، باایں معنی کہ دونوں مخلوق ہیں اس کی۔

"رَبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ"۔

وہ آسمان کا بھی پروردگار اور زمین کا بھی پروردگار۔

مگر پھر بھی بلندی کے رُخ کو جو اس سے تعلق محسوس ہوتا ہے، وہ زمین کا نہیں ہے۔ تو تعلق زمین میں نہیں ہے۔ دعا کیلئے ہاتھ اٹھائے جاتے ہیں، جھکائے نہیں جاتے۔ یہ کس کیلئے؟ حضرت موسیٰؑ کلام کرنے طور کی بلندی پر جاتے تھے۔ زمین کے کسی غار کے اندر نہیں جاتے تھے۔ قرآن کے محاورات دیکھ لیجئے۔ جو چیز اس کی طرف سے آتی ہے، اس کو اتارنا کہا گیا ہے۔ قرآن اس کی طرف سے آیا تو اس کیلئے کہا گیا "اَنْزَلْنَا"، ہم نے اُتارا۔ وحی اس کی طرف سے آئی ہے تو اس کیلئے کہا جائے گا کہ وحی اُتاری۔ ملک اس کی طرف سے آتا ہے تو اس کیلئے کہا جائے گا کہ ملک کو ہم نے اُتارا۔ اب یہ اور بات ہے کہ یہ سب تو ہر ایک کی سمجھ میں آجاتا ہے مگر قرآن میں ایک جگہ لوہے کو بھی کہا گیا ہے کہ ہم نے اُتارا۔ اب عرب کی زندگی کے اعتبار سے وہ لوہار تو نہیں تھے، شمشیر زن تھے تو وہاں فولادی چیز جو ہوتی تھی، وہ تلوار ہوتی تھی۔ وہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے لوہا اُتارا جس میں لوگوں کیلئے خوف و دہشت ہے۔ تو یہ خوف اور دہشت ہتھوڑے سے نہیں ہوتی، آری سے نہیں ہوتی۔ کوئی ایسی چیز، ایسا لوہا جس میں خوف و دہشت مضمر ہو، تو اب دنیا ڈھونڈے کہ کوئی تلوار جو ادھر سے اُتری ہو۔

تو جو اُدھر سے چیزیں آتی ہیں، ان میں کہا جاتا ہے اُترنا اور جو چیزیں اِدھر سے جاتی ہیں، ان کیلئے کہا جاتا ہے بلند ہونا۔ دعا بندے کی چڑھتی ہے، بلند ہوتی ہے۔ عمل صالح انسان کا اگر مقبول ہے تو اوپر جاتا ہے، بلند ہوتا ہے۔ یہ

ہمارا ہی محاورہ نہیں ہے بلکہ قرآن مجید میں ہے، جو نیک عمل ہے، وہ اسے اونچا کرتا ہے۔ نماز اگر مقبول ہے تو یہی آیا ہے کہ آسمانوں پر جاتی ہے۔ تو جو اُدھر سے چیز آتی ہے، اس کو اترنا اور جو چیز ادھر سے جاتی ہے، اس کو چڑھنا۔ یہ آخر محاورہ کیوں ہے؟ بات دراصل یہ ہے کہ عرش یعنی پایۂ تخت کا تصور جس میں پیش کیا گیا ہے، تو یہ اس کا پایۂ تخت ہے۔ اس کے لئے تصور یہ ہے کہ وہ عالمِ اعلیٰ کا بلندترین نقطہ ہے۔ عرش زمین کے نیچے نہیں مانا جاتا۔ آسمانوں پر یہ تصور سے خارج بلندی ہے۔ اُسے عرش مانا جاتا ہے۔ اسے پایۂ تخت مانا جاتا ہے۔ ہاں مگر پایۂ تخت کہنے سے میں یہ نہیں مانوں گا کہ وہ اس پر بیٹھتا بھی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ وہ پایۂ تخت ہے اور اگر اس پر وہ بیٹھتا بھی ہے تو ہماری زمین پر تو اس کا گھر ہے، تو کیا وہ اس گھر میں رہتا بھی ہے؟ مکہ معظّمہ میں وہ مقدس گھر جس کا تمام دنیا جا کر طواف کرتی ہے، اس کیلئے کیا تصور ہے، بیت اللہ۔ تو وہ اللہ کا گھر ہے۔ تو کیا اس گھر میں وہ سکونت فرماتا ہے؟ وہ اس میں رہتا ہے؟ اس کا کسی فرقہ کے مسلمانوں کو تصور نہیں ہے۔ تو جب اس گھر میں رہنے کا تصور نہیں تو عرش کیلئے یہ تصور کیوں کر وہ بیٹھتا ہے؟

اب ایک عقلی بات ہے جسے ہر شخص سمجھ سکتا ہے۔ جسے بیٹھنے کیلئے تخت کی ضرورت ہو، اُسے رہنے کیلئے گھر کی بھی ضرورت ہوگی۔ جب اس کا گھر ہے مگر رہتا نہیں، تو آدمی غور کرے کہ تخت میں یہ تصور کیوں ہے کہ وہ اس پر بیٹھتا ہے؟ میرے نزدیک تو یہ گھر بھی ایک نسبت ہے شرف اور عزت کو بڑھانے کیلئے اور وہ عرش کہنا بھی ایک نسبت ہے شرف اور عزت کو بڑھانے کیلئے۔ مگر جیسی نسبت ہوتی

ہے، عملاً اس کے ساتھ ویسا ہی برتاؤ بھی کیا جاتا ہے۔ یعنی اس نسبت کو اپنے عمل سے نبھایا جاتا ہے۔

صاحبانِ فہم! صاحبانِ عقل! سب سمجھ سکتے ہیں کہ گھر کی نسبت شخص کی طرف نجی اور انفرادی ہوتی ہے۔ تخت و سلطنت کی نسبت بادشاہ کی طرف منصبی ہوتی ہے۔ تو اسے کہہ رہا تھا اپنا گھر۔ اسے کہہ رہا تھا اپنا عرش۔ یہ ہے گھر تو جب گھریلو کام لینا ہوا، کسی کا زچہ خانہ بنانا ہوا تو اسے منتخب کیا اور جب کسی کو سرکاری مہمان بنانا ہوا تو وہاں بلا لیا گیا۔

تو اب یہ دو الفاظ کہہ رہا ہوں، اسے محفوظ رکھیۓ گا، کوئی غلط فہمی نہیں ہوگی کہ جس حیثیت سے عرش اس کا پایۂ تخت ہے، اُس حیثیت سے گویا زمین اُس سے خالی ہے۔ تو یہی تو کہا جا رہا ہے کہ میں زمین میں، جانشین مطلق نہیں کہا گیا، محض جانشین۔ زمین میں جانشین مقرر کرنا چاہتا ہوں۔ تو اب اپنے الفاظ میں یوں کہوں گا کہ ملائکہ سے کہا گیا کہ سنو ملائکہ! یہاں عالمِ بالا میں تو مَیں ہوں، میرا عرش ہے لیکن عالمِ ادنیٰ یعنی زمین اس شرف سے محروم ہے۔ لہٰذا میں ایک ایسے کو بنانا چاہتا ہوں جس کا دارالسلطنت زمین اسی طرح ہو جس طرح میرا دارالسطنت عرش ہے۔ اور ذرا سے الفاظ بدل کر کہوں گا کہ ایسے کو مقرر کرنا چاہتا ہوں جسے زمین سے وہی نسبت ہو جو مجھے عرش سے ہے۔

اب یہ منزل اتنی پرکشش ہے کہ ملک کی نگاہِ طلب پڑتی ہے کیونکہ صحبت میں رہے مگر منصب سے محروم رہے۔ تو یہ بلندی نہیں ہے۔ ظاہری طور پر دور بھی ہو جائے مگر منصب کا حامل ہو کر رہے تو اس میں بلندی ہے۔

یہاں ایک غلط فہمی دور کردوں کہ عرش اس کا پایۂ تخت ہے مگر زمین اس کی ربوبیت سے خارج نہیں ہے۔ اسی طرح زمین اس کا پایۂ تخت ہے مگر عالمِ بالا اس کی رسالت سے باہر نہیں ہے۔ لہٰذا جہاں بھی جائے گا، نمازیں پڑھاتا ہوا جائے گا۔ اقتداء کرتا ہوا نہیں جائے گا۔ امامت کرتا ہوا جائے گا۔ تو یہ تھا ایک پہلو جانشینی کا۔ دوسرا پہلو یہ ہے کہ یہ بات ہی غلط ہے کہ جانشین وہ بنائے جس سے جگہ یا زمانہ خالی ہو۔ یہ بنیادی تصور ہی غلط ہے۔ ایک اور صورت ہے جانشین بنانے کی، وہ یہ ہے کہ کام کرنے کا کسی کا ہو، یعنی کسی طرح سے فریضہ اس کا ہو مگر کسی وجہ سے وہ خود آکر انجام نہ دے سکتا ہو۔

اس کی مثال ایک میں یہ دے سکتا ہوں کہ کوئی معزز آدمی کہیں جائے تو اس کے اعزاز میں جلسہ ہوتا ہے۔ اس جلسہ میں اس کے اعزاز میں سپاسنامہ پڑھا جاتا ہے۔ آئینی طور پر سپاسنامہ کا جواب دینا اسی مہمان کے ذمہ ہے جس کے اعزاز میں وہ جلسہ ہے۔ وہ سپاسنامہ پڑھا گیا ہے مگر اتفاق سے جس جگہ وہ پڑھا گیا ہے اور مجمع میں جو لوگ ہیں، وہ اس کی زبان سے واقف نہیں ہیں۔ یہ ان کی زبان سے واقف نہیں ہے۔ تو ناواقفیت بھی سدِ راہ ہوسکتی ہے۔ وہ ہماری زبان سے واقف نہیں، میں ان کی زبان سے واقف نہیں۔ کوئی سپاسنامہ کا جواب دینے اگر خود سے کھڑا ہو جائے تو میرا فرض ادا نہیں ہوگا۔ غیر آئینی ہے۔ اس کے جواب سے میں سبکدوش نہیں ہوں گا۔ لہٰذا ضرورت ہے کہ انہی میں سے کسی کو میں اپنا نائب بناؤں جو میری زبان سے بھی واقف ہو اور ان کی زبان سے بھی واقف ہو تاکہ وہ میرا جواب میری زبان میں مجھ سے سنے اور ان کی زبان میں

ان تک پہنچائے۔ بس خالق کو خلیفہ بنانے کی اسی لئے ضرورت تھی۔ خلقِ خدا کی رہبری، سیدھے راستہ پر پہنچانا اس کا کام ہے بحیثیتِ رب۔ اگر وہ فقط خالق ہوتا تو خالق کے معنی ہیں پیدا کرنے والا۔ تو پیدا کیا اور بس چھوڑ دیا۔ لیکن وہ فقط خالق نہیں۔ یہی فرق ہے عیسائیوں کے محاورہ میں اور ہمارے محاورے میں۔ وہ خدا کو کہتے ہیں "اَب" یعنی باپ۔ ہم خدا کو کہتے ہیں رب یعنی پالنے والا۔ یہ باپ کا جو لفظ ہے، یہ سببِ وجود کو بتاتا ہے۔ سببِ بقا کو نہیں بتاتا۔

بہت سے بچے ہیں کہ باپ ان کے دنیا سے اٹھ گئے، تب وہ پروان چڑھے تو وجود میں باپ کا دخل ہے، بقا میں نہیں ہے۔ لیکن رب، رب کے معنی ہیں پروان چڑھانے والا۔ یہ بقا کے ہر لمحے میں اس کا رشتہ ہے۔ انہوں نے "اب" کہا ہے۔ یہ رشتہ ماضی ہے اور ہم رب کہتے ہیں، یہ رشتہ حال ہے۔ یعنی ہمارا ہر نفس اس کی توجہ کا محتاج ہے۔ اس کی نگاہ ہم سے ایک لمحے کیلئے ہٹے تو ہماری ہستی نیستی میں بدل جائے۔ یہ سب ہے رب میں مضمر۔ تو اگر فقط خالق ہوتا تو ہدایت اس پر فرض نہ ہوتی۔ لیکن چونکہ وہ رب ہے، پروردگار ہے، اور تربیت کے معنی ہیں کسی شے کو اس کے ممکن درجۂ کمال تک پہنچانا۔ لہٰذا اب صحیح اور غلط کا بتانا، اب اچھے اور برے کی تعلیم دینا۔ اب صحیح راستے پر چلانا، یہ سب فرائض تربیت میں سے ہیں۔ اب قرآن مجید کا ایک ایک لفظ وہ ہے کہ غور کیا جائے تو پردہ ہٹتا ہے کہ اس اعلان میں "قَالَ اللّٰهُ"، نہیں کہا گیا کہ اللہ نے یہ کہا بلکہ "قَالَ رَبُّكَ" تمہارے رب نے یہ کہا۔ اس کے یہ معنی ہیں کہ جو اعلان ہے، وہ تربیت کے ماتحت ہے۔ تربیت اس کا کام، لہٰذا ہدایت اس کا کام۔

قرآن مجید میں ہے: ہر چیز کو اُس نے پیدا کیا، پھر ہدایت کی، مگر انسان کے علاوہ جس جس چیز کی ہدایت ہے، وہ خلقی طور پر ارادۂ قاہرہ سے ہے۔ اس کا کام ہے اسے منزلِ ارتقاء تک پہنچانا۔ یعنی ایک قطرہ اس کی ہدایت سے گہر کی منزل تک پہنچتا ہے۔ ایک بیج اس کی ہدایت سے ثمر تک پہنچتا ہے۔ تو ہر چیز اپنے کمال کی منزل تک بہ ارادۂ الٰہی پہنچتی ہے۔ چیز کے اپنے ارادہ کا دخل نہیں ہے۔ لیکن انسان کو اس طرح منزلِ کمال تک نہیں پہنچانا ہے ورنہ کوئی دنیا میں کافر ہی کیوں ہوتا؟ اگر وہ اپنے ارادۂ قاہرہ سے ہر ایک کو مومن بنانا چاہتا ہو تو کافر دنیا میں رہتے ہی کیوں؟

اگر پروردگار چاہتا تو روئے زمین پر جتنے ہیں، سب مومن ہی ہوتے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوتِ قاہرہ سے اس کو منزلِ کمال تک پہنچانا، یہ منظور نہیں ہے۔ اسے منزل تک پہنچانا تھا، اسے منزل بتا کر چلنے کی دعوت دینا ہے۔ اس کیلئے یہ تھا کہ وہ اسے صحیح راستے پر چلائے۔ اس کیلئے یہ ضروری ہوا کہ صحیح راستہ بتائے اور اس سے کہے کہ ادھر چلو۔ وہ آگے آگے چل کر کیسے بتائے کہ میرے پیچھے آؤ۔ اس کیلئے ضروری ہے کہ جسم رکھنے والے، جسمانیات سے جو الگ نہیں ہیں، یعنی اسی خلقت میں سے کوئی ایسا ہو کہ جس میں ایسی صفائے جوہر ہوں کہ اُس سے فیض لے سکے اور جسمانی طور پر ان کا ہم جنس ہو کہ ان کو پہنچا سکے۔ ایسے دو پہلو مخلوق کی ضرورت تھی جسے وہاں کہا گیا تھا کہ دونوں کی زبان جانتا ہو۔ تو ایسے دو پہلو مخلوق کی ضرورت تھی جو گناہوں سے بری ہونے کی وجہ سے خود اس کا فیض حاصل کرنے کا مستحق ہو اور خلق خدا کو صحیح راستہ بتانے کیلئے ان کی

ضروریات میں شریک ہوتا کہ ان پر حجت تمام کر سکے۔ اگر اُسے بھوک نہ لگتی ہو اور وہ کہے کہ روزہ رکھو تو خلق خدا کہے گی کہ جناب! آپ کو بھوک کا مزہ ہی نہیں معلوم۔ آپ سمجھتے ہیں کہ روزہ رکھنا کوئی آسان ہے؟ آپ کیا جانیں کہ پیاس کیا چیز ہوتی ہے؟ تو دن بھر پیاسا رہنا کہیں ہوسکتا ہے؟ جو جو حکم وہ دے، دنیا کہے کہ جناب! ان تمام خواہشات سے آپ بری۔ آپ مثالِ عمل کہاں بن سکتے ہیں؟

تو خلق خدا پر حجت تمام نہ ہوتی۔ لہٰذا ایک ایسا ہونا چاہئے، اور میں ایک لفظ پر اس کو ختم کرتا ہوں، دنیا کہتی ہے کہ کہا گیا کہ تمہاری ہی طرح بشر ہوں، تو ہم ہی جیسے ہیں۔ بالکل ہمارے جیسے ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ یہ کہا تھا کہ تمہارے جیسا بشر ہوں، یہ نہیں کہا تھا کہ تمہارے جیسا جاہل ہوں۔ یہ کہا تھا کہ تمہارے جیسا بشر ہوں۔ یہ نہیں کہا تھا کہ تمہاری طرح خطا کار ہوں۔ تو بشریت پر ایمان لانا تو میں جزوِ دین سمجھتا ہوں، بشریت کا انکار میں کفر سمجھتا ہوں۔ مگر بس دیکھنا یہ کہ کیسا بشر! میں کہتا ہوں کہ یہ بشر ایسے ہیں، دنیا ملک کہنا ان کی تعریف سمجھتی ہے، میں ملک کہنا ان کی توہین سمجھتا ہوں۔ یہ ملک اور انسان کی فضیلت کا جزو غالباً اسی سلسلہ بیان میں کل آپ کے سامنے عرض ہوگا۔

تو حضورِ والا! ایسا بشر ہو جو خالق سے اس کا فیض حاصل کر سکے اور ہم تک اس کے فیض کو اپنی زبان میں جو ہماری بھی زبان ہے، پہنچا سکے۔ تو اسے وہ اپنا جانشین بنائے، اپنا نائب بنائے کیونکہ نائب ہونے کے یہ معنی ہیں کہ اس کا کام اُس کا کام ہو جائے۔ اب یہ جو ہدایت کرے گا، وہ اس کی ہدایت نہیں ہوگی بلکہ وہ اُس کی طرف کی ہدایت ہوگی جس نے نائب بنایا ہے۔ تو اب چاہے اس کو

ہدایت کرنے والا کہئے، چاہے اُس کو ہدایت کرنے والا کہئے، اس لئے اس کو ہم کہیں گے ہادی اور قرآن کہے گا:

"اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرٌ وَّلِكُلِّ قَوْمٍ هَادٍ"۔

کہ اے رسول! آپ منذر ہیں، نبی اور رسول بھی ہیں لیکن انذار یعنی رسالت کا دروازہ بند ہوا ہے، ہدایت کا دروازہ بند نہیں ہوا۔ ہر نسل، ہر طبقہ کیلئے ہادی ہیں، یعنی رسالت ختم ہوئی ہے، ہدایت ختم نہیں ہوئی۔ ناموں سے حقیقت نہیں بدلتی۔ میں کہتا ہوں کہ کبھی ہدایت بنامِ رسالت ہوتی ہے، کبھی ہدایت بنامِ امامت ہوتی ہے۔ لیکن ہدایت کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا اور بس۔ گزشتہ بیان کی روشنی میں ایک جملہ کہہ کر آگے بڑھوں کہ جنابِ والا! جب میں نے عرض کیا کہ ہدایت تقاضائے ربوبیت ہے تو بس ایک جملہ کافی ہے یعنی جب تک اس کی ربوبیت ہے، تب تک ہدایت ہے۔ اب یہ اتنا بلند منصب ہے کہ ملائکہ نے کہا:

"اَتَجْعَلُ فِيْهَا مَنْ يُّفْسِدُ فِيْهَا وَيَسْفِكُ الدِّمَآءَ"۔

کیا تُو انہیں مقرر کرے گا جو فساد کریں اور خونریزی کریں؟ بس بس۔ غیر متوازن الفاظ کبھی کبھی ناسمجھی سے استعمال کر لئے جاتے ہیں۔ شاید آپ نے سنا ہو یا کسی نے کہا ہو کہ ملائکہ نے اعتراض کیا۔ یاد رکھئے ملائکہ جو ہیں، وہ عصمتِ فطری کی منزل پر فائز ہیں اور قرآن کہہ رہا ہے:

"لَا يَسْبِقُوْنَهٗ بِالْقَوْلِ وَهُمْ بِاَمْرِهٖ يَعْمَلُوْنَ"۔

وہ اللہ پر بات کرنے میں سبقت ہی نہیں کرتے۔ وہ وہی کرتے ہیں جو اس کا حکم ہوتا ہے۔ تو اب فرشتوں کیلئے یہ کہنا کہ انہوں نے اعتراض کیا۔ تو میں

ہرگز نہیں کہوں گا کہ اعتراض کیا۔ میں بس یہی کہوں گا کہ تعجب سے سوال کیا اور اب ذرا سی علمی بات ہے کہ کوئی اطلاع دی جائے تو اس میں جھوٹ اور سچ کا سوال ہے۔کوئی بات پوچھی جائے تو اس میں جھوٹ اور سچ کا سوال نہیں۔فرشتہ خود کچھ نہیں کہہ رہا، وہ تو ایک بات پوچھ رہا ہے۔تو پوچھنے میں جھوٹ کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر فرشتے نے کام کیا کیا ہے؟ فرشتے نے کام یہ کیا کہ نوعِ انسان کی زندگی کا ایک تاریک رُخ لیا جو بلاشبہ ہے۔کون کہہ سکتا ہے کہ انسان فساد نہیں کرتا۔کون کہہ سکتا ہے کہ انسان خونریزی نہیں کرتا۔تو ایک تاریک رُخ لیا انسان کا جو اس کی نظر میں بہت تاریک تھا۔فساد تو بلاشبہ تاریک ہے ہی اور خونریزی بھی، جو بطورِ فساد ہو۔اس کے تاریک ہونے میں کیا شبہ ہے؟ تو اس رُخ کو لیا جو بے شک ہے اور اپنی زندگی کا روشن پہلو لیا جو حقیقتاً ہے۔لیکن انسان کی مجال ہے کہ وہ کہے کہ ملک تسبیح نہیں کرتا، تقدیس نہیں کرتا۔ جو اپنی صفت تسبیح و تحلیل کی بتائی، وہ حقیقتاً ہے۔ جو عام انسانوں کی صفت بتائی، فساد اور خونریزی، وہ بھی ہے۔ ہر جزو صحیح۔بس کام یہ کیا کہ دونوں کو ملا کر پوچھ لیا۔اپنی زندگی کا روشن رُخ ، ان کی زندگی کا تاریک رُخ۔ان دونوں کو ملا کر پوچھ لیا کہ کیا انہیں مقرر کیا جائے گا؟ ہمیں نہیں؟

نتیجہ پھر ملک نے نہیں نکالا کہ ہم زیادہ حقدار ہیں کیونکہ یہ نتیجہ جھوٹ ہوتا۔ یہ نتیجہ غلط ہوتا۔ یہ نتیجہ ملک نے نہیں نکالا۔اسے سادہ لوح انسانوں پر چھوڑا کہ وہ یہ ہی نتیجہ نکالیں گے۔مگر یہ پوچھا ہی کیوں؟ میں نے کہا کہ یہ سوال ہی کیوں کیا؟ تو یاد رکھئے کہ سوال کرنے کا حق تو بہر حال انہیں یوں تھا کہ وہ بارگاہِ

قدس کے طالب علم ہیں اور طالب علم کی سمجھ میں جو بات نہ آئے، اسے اُستاد سے پوچھنے کا حق ہے۔ متعلم ہونے کے ساتھ ساتھ یہ اجازت لازمی طور پر حاصل ہے ورنہ فریضہ تعلیمی ادا ہی نہیں ہوگا۔ معلم ہونے کا رشتہ اس بات کا متقاضی ہے کہ وہ طالب علم کو حق دے کہ جو بات سمجھ میں نہ آئے، اسے مجھ سے پوچھنا۔ اور یہاں وہ پوچھنا کسی مقصدِ الٰہی کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ میرے نزدیک اگر وہ یہ نہ پوچھتے تو ایک مقصدِ الٰہی پورا ہونے سے رہ جاتا۔ وہ مقصدِ الٰہی کیا ہے؟ ایک تو جو میں پہلے کام لے چکا ان کے اس سوال سے، وہ یہ ہے کہ مقصد کی جلالت نمایاں ہوئی کہ یہ منصب ایسا بلند ہے کہ ملک کی نگاہِ طلب بھی پڑتی ہے۔ اب خلق خدا کیلئے انتباہ ہے کہ اسے کبھی ارزاں نہ بنا لینا۔ اتنا اونچا ہے یہ منصب۔ اور وہ بھی اسی نام سے جسے تم نے ارزاں بنایا۔

یہاں اعلان جو کیا گیا، وہ اسی نام سے کہ اسے ارزاں نہ بنا لینا۔ یہ ایک مقصد ہے جو میں پہلے یہ کام لے چکا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ ملک نے سوال کیا اور خالق نے وہ جواب دیا جو بعد میں دیا جائے گا۔ یہ تمام دنیا کو دکھانا ہے کہ دیکھو! اس منصب کا اختیار ایسا میری ذات سے خاص ہے کہ جس میں ملک کے معصوم مشورہ کو بھی دخل نہیں ہے، چہ جائیکہ خطاکاروں کا اجماع یا شوریٰ۔

بس اب آیت پوری پڑھ چکا ہوں، اس کے بعد اس کے اجزاء سے متعلق جو باتیں ہیں، وہ کل عرض ہوں گی، خالق نے جواب دیا:

"اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ"۔

میں وہ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔ اس پر تبصرہ کل ہوگا۔ مگر میں کہتا ہوں

کہ اصولِ نیابت شروع یہاں سے ہوا۔ نائب ابھی میں نے کہا کہ وہ کام کرے جو اس کا کام ہو۔ جس کے کام کو وہ اپنا کام کہہ سکے اور جس کے کام کو دنیا اس کا کام کہہ سکے، وہ نائب ہے۔ تو انبیاء اللہ کے نائب ہیں، مرسلین اللہ کے نائب ہیں۔ ہمارے نزدیک آئمہ حق اللہ کے نائب ہیں۔ آدم اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے۔ نوح اپنے دور میں خلیفۃ اللہ تھے۔ ابراہیم اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے۔ موسیٰؑ و عیسیٰؑ اپنے اپنے وقت میں خلیفۃ اللہ تھے اور ہمارے پیغمبر بلا قیدِ وقت خلیفۃ اللہ تھے۔

بہر حال عملی حیثیت سے اپنے دور میں جب اس دارِ دنیا میں تشریف رکھتے تھے تو جو جو ہدایات فرماتے تھے، وہ بحیثیت خلیفۃ اللہ کے تھیں اور جب دنیا سے تشریف لے گئے تو جو ان کی جگہ پر ہدایتِ خلق کے منصب پر ہو، وہ خلیفۃ اللہ ہے۔ اس طرح ایک بڑی مشکل جو اکثریت کو پیش آئی، وہ ہمارے ساتھ پیش نہیں آئی۔ یعنی اکثریت کو یہ مشکل پیش آئی، متفقہ بات ہے کہ جب پیغمبر خدا دنیا سے اٹھے اور دنیا نے اپنا نظام بنامِ خلافت چلایا، تو اب پہلا فرد، تو انہوں نے کہنا شروع کیا، خلیفۃ رسول اللہ۔ بہت کھلی ہوئی بات ہے، غور کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ پیغمبر دنیا سے گئے ہیں۔ ہم ان کا جانشین بنا رہے ہیں تو خلیفۃ رسول اللہ۔ تو اب جو آتا ہے، وہ کہتا ہے:

"اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَا خَلِيْفَةَ رَسُوْلِ اللّٰهِ"۔

سلام ہو آپ پر اے خلیفہ نبی۔ سلام ہو آپ پر اے رسول اللہ کے خلیفہ۔

اب اس وقت وہ بعد کی مشکل ذہن میں نہیں آئی تھی کہ بات کہاں تک

پہنچے گی۔ کوئی دقت نہ ہوئی، عمر گزر گئی۔ مختصر تو ہوتی ہے عمر۔ وہ اتنے دن تک کہتے رہے خلیفۃ رسول اللہ۔ اب نمبر بڑھا۔ نمبر جو بڑھا تو خود صاحبِ اقتدار جو موجود تھے، اب ان کے ذہن میں دشواری پیدا ہوئی۔ خود ان کے ذہن میں کشمکش پیدا ہوئی کہ صاحب! اب میں کیا کہا جاؤں؟ اب وہ بیچ میں ایک کڑی آ گئی۔ تو اب علم معنی و بیان کی ہمارے ہاں ایک اصطلاح ہے "تتابُعِ اِضافات"۔ یعنی پے در پے اضافت۔ تو اب رسول اللہ کا خلیفہ، تاکہ رسول پہنچایا جائے۔ بغیر اس کے تع تقدس نہیں پیدا ہوگا۔ تو رسول اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔

خیر صاحب! تھوڑی سی تو زحمت ہوئی ہے۔ یونہی سہی۔ اب آگے بڑھے تو دو اضافتیں آئیں۔ رسول اللہ کے خلیفہ کا خلیفہ۔ اب ذہن میں ہے کہ یہ تو سلسلہ رہے گا۔ اس وقت مصطفیٰ کمال پاشا کی کسے خبر تھی کہ وہ آ کر اس سلسلہ کو ختم کر دے گا۔ حوصلہ تو یہ تھا کہ رہے۔ تو صاحب! یہ بڑی زحمتِ بے جا ہے۔ تو کیونکر حل ہوا اس کا؟ مجمع کیا گیا۔ مجلس شوریٰ قائم ہوئی اور اس میں پیش کیا گیا کہ بھائیو! یہ بڑی مشکل ہے۔ تمہاری سمجھ میں اب تک نہ آئی۔ لیکن بحمد للہ میری سمجھ میں یہ مشکل آئی کہ اب کیا ہو۔ تم بتاؤ کہ اس کا حل کیا ہو؟ یعنی مشکل سمجھ میں آ گئی ہے، حل سمجھ میں نہیں آیا ہے۔ مشکل کے حل کیلئے مدد کی ضرورت ہے۔ تو بتاؤ کہ کیا ہو؟ نکتہ رسی سے کام لے کر اُسے نہیں بلوایا گیا تھا کہ جس کا کام ہی مشکل کشائی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ کچھ احساس تھا کہ وہ جو بنیادی طور پر، بنیادِ مشکل سے الگ ہے، اس سے متفق نہیں ہیں۔ بہر حال موجود لوگوں میں سے کوئی لال بجھکڑ تھا، سمجھ دار آدمی، ذہین۔ تو اس نے یہ کہا کہ صاحب! اس جھگڑے ہی کو

چھوڑ یئے ۔ ارے ہم مومنین ہیں، آپ ہمارے امیر ہیں۔

لہٰذا یہ خلیفہ کا جھگڑا ہی ختم کیجئے۔ مصطفےٰ کمال پاشا نے بعد میں ختم کیا۔ انہوں نے اسی وقت ختم کر دیا کہ صاحب! یہ جھگڑا نہیں۔تو سن لے آپ نے کہ ہم مومنین اور آپ ہمارے امیر۔کہا: کیا عمدہ رائے تم نے تجویز کی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پہلے ہی قدم میں رسول سے تو رشتہ منقطع ہو گیا۔ اب جمہور سے رشتہ رہ گیا۔تو جناب! اب یہ سلسلہ شروع ہو گیا اور نسل در نسل چلتا رہا اور ہر دَور میں چلتا رہا۔ جب تک کہ وہ سلسلہ ختم نہیں ہو گیا۔ اور جناب! ہمارے لئے یہ مشکل نہ پہلے تھی، نہ بعد میں ہوئی۔ ہمارے نزدیک بیچ میں کسی مخلوق کا قدم آتا ہی نہیں۔ ہمارے نزدیک رسولؐ اللہ بھی خلیفۃ اللہ، علیؑ مرتضیٰ بھی خلیفۃ اللہ، حسنؑ مجتبیٰ بھی خلیفۃ اللہ، حسینؑ بھی خلیفۃ اللہ۔ پورا سلسلہ ہے خلفائے خدا کا۔سب نائبِ خدا ہیں اور نائبِ رسول بھی ہیں۔ نائب کا نائب بھی نائب ہی ہوتا ہے۔لہٰذا اس کے خلاف بات نہیں ہے۔

تو وہ اصول کہ جو اس کا کام ہو، وہ اُس کا کام ہو۔تو یہ نیابت کا تقاضا اور جو اس کے ساتھ عمل ہو، وہ اس کے ساتھ عمل۔ یہی نیابت کا تقاضا ہے۔اب میں قرآن مجید کی آیتیں پڑھتا ہوں۔

مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ

”جس نے رسول کی اطاعت کی، اُس نے اللہ کی اطاعت کی“۔

یعنی پہلی اضافت ان کی طرف اطاعت کی۔ پھر وہی اس کی طرف اضافت۔کیا مطلب؟ چونکہ نائب ہیں، لہٰذا جو اُن کی اطاعت وہ اُس کی اطاعت۔

اِنَّ الَّذِيْنَ يُبَايِعُوْنَكَ اِنَّمَا يُبَايِعُوْنَ اللّٰهَ ۭ يَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَيْدِيْهِمْ ۚ

یہ جو آپ سے بیعت کر رہے ہیں، وہ اللہ سے بیعت کر رہے ہیں۔ بیعت ہے ان کے ہاتھ پر مگر وہ کہہ رہا ہے کہ میری بیعت ہے۔ یہ اللہ کا ہاتھ ہے ان کے ہاتھ پر ورنہ وہ جسم و جسمانیات سے بری، اس کے ہاتھ کہاں سے آئے؟ اسی دن کیلئے تو نائب بنایا ہے۔ تو جو اس کے ساتھ برتاؤ، وہ اس کے ساتھ برتاؤ۔ جو ان کی نافرمانی کرے، اس نے اللہ کی نافرمانی کی۔ نیابت کا تقاضا یہاں نظر آ رہا ہے۔

جنابِ والا! بس، یہ اصول سمجھ لیجئے کہ جو اس کے ساتھ ہے، وہ اُس کے ساتھ اور جو اس کا کام، وہ اُس کا کام۔ اب جہاں جہاں یہ بات نظر آئے، سمجھ لیجئے کہ یہ نیابت کی دوسری نظیر ہے یعنی نائب ہونے کا ثبوت ان الفاظ سے ہوتا ہے۔ اب دیکھئے متفق علیہ حدیث، صحاحِ ستہ کی ہے کہ رسولؐ نے کہہ دیا:

"يَا عَلِيُّ حَرْبُكَ حَرْبِيْ سِلْمُكَ سِلْمِيْ"۔

یا علی! تمہاری جنگ میری جنگ،

اس دوسرے لفظ کا ترجمہ ذرا مشکل سے ہوتا ہے۔ لوگ ترجمہ کرتے ہیں، تمہاری صلح مگر صلح کے لفظ سے ذہن میں آتا ہے، لڑنے کے بعد صلح کرنا تو اس کے معنی ہیں کہ پہلے لڑے۔ شاعر نے کہا ہے کہ بڑا مزا اس ملاپ میں ہے جو صلح ہو جائے جنگ ہو کر۔ اس سے وہ مفہوم ادا نہیں ہوگا جو رسول نے کہا ہے۔ ان کا مطلب یہ نہیں ہے کہ لڑ کر آدمی پھر صلح کرے بلکہ حرب کے مقابلہ میں جو چیز ہوتی

ہے، تم سے جنگ، مجھ سے جنگ۔ اور اب میں اُردو زبان میں کہنے کی کوشش کروں کہ تم سے ملاپ رکھنا، ملاپ کرنا نہیں، تم سے ملاپ رکھنا، مجھ سے ملاپ رکھنا ہے۔ اور بعض الفاظ ہیں جو ہمارے محاورہ میں نہیں تھیں۔ مگر اخباروں سے یاد آتی ہیں، وہ ادائے مطلب میں مجھے یہاں مدد پہنچائیں گی۔

تو جناب! یہ ہمارا محاورہ نہیں تھا مگر اخباروں میں بہت دیکھا ہے۔ وہ میرے مطلب کی بات ہے۔ وہ کیا؟ کہ ان سے جنگ، مجھ سے جنگ اور تم سے ناجنگی، مجھ سے ناجنگی۔ یہ حرب اور سلم دونوں مصدر ہیں۔ اُردو میں مصدر کے آخر میں "نا" ہوتا ہے۔ حرب کے معنی لڑنا اور سلم کے معنی نہ لڑنا۔ حرب اور سلم دونوں عربی زبان میں مصدر ہیں۔ ہر زبان میں مصدر کی اضافت کبھی فاعل کی طرف ہوتی ہے اور کبھی مفعول کی طرف۔

کوئی دوست آپ کے ایسے تھے کہ بچہ پر غصہ آیا تو بیدردی سے مار رہے ہیں۔ آپ ملاقات کو گئے۔ وہ بچے کو ایسی شدت سے مار رہے تھے کہ آپ ٹھہرے نہیں، واپس آ گئے۔ دوسرے دن انہوں نے کہا: ارے بھئی! آپ آئے اور ٹھہرے ہی نہیں۔ تو ان کے جواب میں آپ کہئے گا کہ تمہاری مار سے مجھے ایسی اذیت ہوئی، ایسی تکلیف ہوئی، تمہاری مار سے کہ مجھ سے دیکھا نہ گیا، میں چلا گیا۔ کیا مطلب؟ یہ اضافت فاعل کی طرف ہے۔ تمہاری مار سے۔ یعنی تم جو مار رہے تھے اپنے بچے کو، یہ ہوئی اضافت فاعل کی طرف۔ اب خدانخواستہ کوئی آپ کے شناسا، انہیں راستے میں کسی نے زدوکوب کر دیا۔ آپ کو خبر پہنچی۔ آپ سے ملاقات ہوئی تو آپ نے بطورِ ہمدردی کہا کہ بھئی! تمہاری مار سن کر مجھے

بہت تکلیف ہوئی۔ اب "تمہاری مار" کے کیا معنی ہوئے؟ یعنی تم پر جو مار پڑی۔ تو یہ اضافت مفعول کی طرف ہوئی۔ وہاں اضافت فاعل کی طرف تھی۔ یہاں تماری مار جو لفظ ہے، اس کی اضافت مفعول کی طرف ہے۔ اب رسول فرما رہے ہیں: "یَا عَلِیُّ حَرْبُكَ حَرْبِیْ"۔ حدیث ہے متفق علیہ۔ دونوں معنی ہیں۔ دنیا کو جو پسند ہوں۔ دونوں مفہوم پیش کئے دیتا ہوں۔ اگر اضافت فاعل کی طرف ہے تو یہ معنی ہوں گے کہ یا علی! تمہارا جنگ کرنا میرا جنگ کرنا ہے۔ تو اب جس جس سے بھی علیؑ نے جنگ کی ہو، اُسے سمجھئے کہ رسولؐ اللہ نے جنگ کی۔ اگر اضافت مفعول کی طرف ہو تو معنی ہو گئے کہ تم سے جنگ کرنا مجھ سے جنگ کرنا ہے۔

تو اب تاریخ میں دیکھ لیجئے کہ جس جس نے ان سے جنگ کی ہو، اب نہ رشتہ دیکھئے گا، نہ صنف دیکھئے گا۔ اب ایک خاتونِ معظّمہ، وہ بھی متفق علیہ حدیث ہے کہ فرمایا:

"فَاطِمَةُ بَضْعَةٌ مِنِّیْ"۔

"فاطمہ میرا ایک جزو ہے"۔

"مَنْ اٰذَاهَا فَقَدْ اٰذَانِیْ"۔

"جس نے اسے تکلیف دی، اس نے مجھے تکلیف دی"۔

"وَمَنْ اَغْضَبَهَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ"۔

"اور جس نے اسے غضبناک کیا، اُس نے مجھے غضبناک کیا"۔

میں نے ابھی کہا کہ یہ ترکیب کہ جو اس کے ساتھ ہو، وہ میرے ساتھ ہوا۔ یہ نیابت کا پتہ دیتا ہے۔ اب چاہے اس نیابت کی اس قسم کا مجھے نام نہ معلوم

ہو، ناموں سے فرق نہیں پڑتا۔ کبھی وہ نیابت بصورتِ نبوت ہوتی ہے۔ کبھی نیابت بصورتِ رسالت ہوتی ہے۔ کبھی نیابت بصورتِ امامت ہوتی ہے۔ اب اس نیابت کا خواہ مجھے نام معلوم نہ ہو، مگر ان الفاظ کی رو سے ماننا پڑے گا کہ یہ بھی نائبِ رسول ہیں اور بچوں کیلئے کہا:

"مَنْ اَحَبَّہُمَا فَقَدْ اَحَبَّنِیْ وَمَنْ اَغْضَبَہُمَا فَقَدْ اَغْضَبَنِیْ"۔

" جس نے ان سے محبت کی، اس نے مجھ سے محبت کی اور جس نے ان کو غضبناک کیا، اس نے مجھ کو غضبناک کیا"۔

جو نیابت کے تقاضے ہیں، سب نظر آرہے ہیں یا نہیں! یہ سب احادیثِ پیغمبر ہیں۔ اس سے پہلے قرآن مجید کی آیتیں تھیں جو رسول کی نیابت کے بارے میں مَیں نے پیش کیں۔ اب بہت جانی پہچانی شخصیت، شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی، جن کی کتاب ردِ شیعہ میں تحفہ اثناءعشریہ، اپنے طبقہ کیلئے مایہ ناز کتاب ہے۔ اس کے مصنف، تو جناب ان کی کتاب ہے سر الشہادتین۔ اس میں وہ کہتے ہیں کہ خدا نے ہمارے رسول کو وہ سب فضیلتیں عطا کیں جو تمام انبیاء کو ملیں بلکہ اس سے بالاتر۔ لیکن ایک صفت انبیاء کو ملی تھی جو براہِ راست ہمیں ان کے ہاں نظر نہیں آتا۔ وہ ہے شہادت۔ لہٰذا خالق کو یہ منظور ہوا کہ صفتِ شہادت ان کے فضائل میں رہ بھی نہ جائے اور براہِ راست ان پر کسی دشمن کا وار کام بھی نہ کرے۔ اس کیلئے اللہ نے ان کو دو نواسے عطا فرمائے اور شہادت کی دو اقسام ہیں۔ ایک شہادتِ سرّی اور ایک شہادتِ جہری۔

مخفی شہادت زہر سے ہوتی ہے اور اعلانیہ شہادت تلوار سے ہوتی ہے۔

دونوں شہادتیں دونوں نواسوں پر تقسیم ہوگئیں۔ حسن علیہ السلام کے حصہ میں شہادتِ سرّی آئی اور حسین علیہ السلام کے حصہ میں شہادتِ جہری آئی۔ یعنی کھلم کھلا شہادت۔ ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ نے صفتِ شہادت کو فضائل رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں شامل کر دیا۔

اس کا نتیجہ؟ انہوں نے فرمایا کہ اگر وہ میرے سامنے ہوتے تو میں بڑے احترام سے عرض کرتا۔ بہت بڑے آدمی ہیں، میں بڑے احترام سے عرض کرتا ہوں کہ یہاں تک تو آپ نے فرمادیا، جو میں سوال کروں، اس کا جواب دیجئے کہ جب اِن کی شہادت اُن کی شہادت، تو جو اِن کا قاتل ہے، وہ اُن کا قاتل۔

اب جناب! نہ ہچکچایئے گا، جتنے زور سے آپ نے وہ بات کہی، اتنے ہی زور سے میری بات کا جواب دے دیجئے گا اور سوائے ایک جواب کے دوسرا ہو ہی نہیں سکتا۔ آپ کو منطقی طور پر قبول کرنا پڑے گا کہ جو اِن کا قاتل، وہ اُن کا قاتل یعنی رسول کا قاتل۔ اب یہ جملہ ان کا ابھی تک ہے مگر کھول کر دونوں ٹکڑے کہہ دیجئے کہ جو حسنؑ کا قاتل، وہ رسولؐ کا قاتل اور جو حسینؑ کا قاتل، وہ بھی رسولؐ کا قاتل۔ اب کوئی بحث نہ کیجئے گا کہ حسینؑ کے قاتل کو یہ یہ کہا جائے یا نہیں۔ بس آپ جو جو رسولؐ کے قاتل کو کہہ سکتے ہیں، وہ کہئے۔ ایک اور سوال کا جواب ہوجائے۔ ہم سے یہ سوال کیا جاتا ہے، طرح طرح کی منطقی باتیں سوچ سوچ کر ہماری عزاداری پر کہی جاتی ہیں۔ یعنی ہاتھ ہم اپنے سینوں پر مارتے ہیں، دل دوسروں کے دہلتے ہیں۔ روتے ہم ہیں، صدمہ دوسروں کو ہوتا ہے۔ طرح طرح کے منطقی سوال سامنے آتے ہیں کہ وفاتِ رسولؐ پر اتنا غم و ماتم نہیں ہوتا جتنا امام حسینؑ کی شہادت پر ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تم ان کو

رسولؐ سے بڑھاتے ہو۔

تو اب اس کا جواب تو یہ ہے کہ میں یہ کہوں کہ اچھا صاحب! نواسے کو ہم نے حصہ میں لے لیا ہے، رسولؐ کو آپ حصہ میں لے لیجئے۔ ہم وعدہ کرتے ہیں کہ اس میں ہم آکر آپ کے ساتھ شریک ہوں گے، آپ اس میں ہمارے ساتھ شریک ہوجائیں۔

جناب شاہ عبدالعزیز کے مطابق سال میں دو تاریخیں ہیں، ایک وفاتِ رسولؐ کی، ایک شہادتِ رسولؐ کی۔ وہ ربیع الاوّل کی کسی تاریخ کو ہے اور یہ جو دس محرم کو ہے، یہ شہادتِ رسولؐ کی تاریخ ہے۔ اب آپ بتایئے کہ وفات کی یادگار قائم کریں یا شہادت کی؟ اور اب مصائب میں مَیں کہتا ہوں کہ اسے ہم سے کیوں پوچھتے ہیں؟ آسمان سے پوچھیں کہ وفاتِ رسول پر خون کیوں نہیں برسا؟ حسینؑ کی شہادت پر کیوں خون برسا؟

اسے سید کمال الدین محمد ابن طلحہ شافعی کی "مطالب السئول" میں دیکھ لیجئے۔ علامہ ابن حجر مکی کی "صواعق محرقہ" میں دیکھ لیجئے، خواہ سبط ابن جوزی کی "تذکرۂ خواص الآئمہ" میں دیکھ لیجئے کہ دس محرم کے بعد چالیس دن تک جو کپڑا زیر آسمان پھیلایا جاتا تھا، اُس پر خون کے دھبے نظر آتے تھے۔ اہل عزا دیکھیں کہ عاشورے ہی کی تاریخ اِدھر سے مقرر نہیں ہوئی بلکہ چہلم کی تاریخ بھی اُدھر سے مقرر کی ہوئی ہے۔ یعنی اس نے بیس صفر تک کائنات کو سوگوار رکھا ہے۔ چہلم کے دن تک، بیس صفر تک خون برس رہا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پیغمبر خدا کے غم میں سیدہؑ عالم رو رہی تھیں، علیؑ رو رہے تھے، حسنینؑ رو رہے تھے، ارے صحابہ میں

بھی جن جن کو رونے کی فرصت تھی ، وہ رو رہے تھے۔ سب ہی سیاست دان نہیں تھے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے "مدارج النبوۃ" میں کہا کہ بعض صحابہ گریبان پھاڑ پھاڑ کر جنگلوں میں نکل گئے اور مدینہ میں کہرام برپا تھا۔ یہ تاریخ سے ثابت ہے۔ تو یقینا یہ سب رو رہے تھے۔ مگر حسینؑ کے غم میں تو رسولؐ اللہ رو رہے ہیں او رپھر دیکھئے کہ جنابِ اُم سلمہ نے خواب دیکھا اور یہ بھی متفق روایت ہے کہ جس نے خواب میں مجھ کو دیکھا، اس نے مجھ ہی کو دیکھا کیونکہ شیطان کی یہ مجال نہیں کہ میری صورت میں آئے۔ یہ صحیح مسلم و بخاری کی متفق حدیث ہے۔ اب دیکھئے صحیح ترمذی میں کہ جنابِ اُمِ سلمہ، اب کوئی اور خواب دیکھتا تو کوئی یہ بحث پیدا کرسکتا تھا کہ وہ رسولؐ کی صورت کو کیا جانے؟ لیکن جنابِ اُمِ سلمہ کے بارے میں تو یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ رسولؐ نے ایک خاک دی تھی کہ اسے رکھ چھوڑو۔

یہ بھی صحیح ترمذی میں ہے کہ جب یہ خون ہوجائے تو سمجھنا کہ میرا فرزند حسینؑ شہید ہوگیا ہے۔ یہ خاک جب حسینؑ کے سفر کے بعد دیکھتی تھیں تو دل کو ڈھارس ہوجاتی تھی کہ حسینؑ زندہ ہیں۔

مصائب

اس وقت گھر والوں کو کون بتاتا کہ مسافر حسینؑ پر کیا بیت رہی ہے؟ تو جب دل اُلجھتا تھا تو اُمِ سلمہ اس خاک کو دیکھ لیتی تھیں۔ لیکن جب محرم کا چاند ہو گیا تو دل کی اُلجھن اتنی بڑھ گئی کہ خاک کو دیکھ کر وقتی تسلی تو ہوتی ہے مگر جب دم اُلجھتا ہے تو مکمل طور پر دل کو قرار نہیں آتا۔ اب روز خاک پر نظر ڈالنے لگیں۔ اب جو عاشورہ کا دن آیا تو خاک کو اصلی حالت پر دیکھ رہی ہیں، تب کبھی دل نہیں ٹھہرتا ورنہ بار بار آکر کیوں دیکھتیں؟

اربابِ عزا! دوپہر تک دیکھا، خاک اصلی حالت پر ہے، پھر دل کو قرار نہیں، راز سمجھ میں نہیں آتا، خاک کی رنگت نہیں بدلی، خاصیت بدل گئی، رنگت وہی ہے لیکن اب دل کو تسلی نہیں ہوتی اُسے دیکھ کر۔ ارے میں کہتا ہوں پہلے بھی دیکھا تو خاک ہی تو بتا رہی ہے کہ حسینؑ زندہ ہیں، صادق رسول کا قول ہے، خاک اصلی حالت پر ہے لیکن کیا عباسؑ بھی زندہ ہیں؟ کیا علیؑ اصغر بھی زندہ ہیں؟ کیا قاسمؑ بھی زندہ ہیں؟ کیا علیؑ اکبر بھی زندہ ہیں؟ کیا فاطمہؑ صغریٰ کا وہ ننھا مسافر بھائی بھی زندہ ہے؟ چونکہ حسینؑ زندہ ہیں، لہٰذا خاک اصلی حالت پر ہے۔ دن بھر کی تگ ودو سے اور پریشانی سے اتنی تھک گئیں کہ اپنے حجرے میں آکر لیٹ گئیں۔ سونے میں عصر کا ہنگام آیا۔ اب پھر صحیح ترمذی کی روایت ہے کہ عصر کا ہنگام آیا تو رسولؐ اللہ سامنے بغیر عمامہ کے ہیں، سر وریش مبارک پر خاک پڑی ہوئی، بال بکھرے ہوئے، پوچھتی ہیں: یارسول اللہ! کیا ماتم ہے؟ فرماتے ہیں: تمہیں نہیں خبر؟ میرا فرزند حسینؑ قتل ہو گیا۔

فرماتے ہیں: میں صبح سے اس وقت تک کربلا میں تھا، یہ میرے

سرو ریش پر خاکِ کربلا ہے۔ یہ حسینؑ اور انصارِ حسین کا خون ہے جو دن بھر
میں جمع کرتا رہا ہوں۔

اے اہلِ عزا! جنابِ رسالتمآبؐ فرماتے ہیں کہ دن بھر میں کربلا میں
رہا ہوں تو علیؑ اکبر کے سینے پر برچھی لگی، رسولؐ اللہ دیکھ رہے تھے، عباسؑ کے
شانے کٹے، رسولؐ اللہ دیکھ رہے تھے اور ننھا مسافر کربلا کا حسینؑ کے ہاتھوں پر
نشانہ تیرِ ستم ہوا، رسولؐ اللہ کی آنکھوں کے سامنے اور وہ جسے کاندھے پر چڑھاتے
تھے، جسے سینے پر لٹاتے تھے، اُس کو تہہ خنجر دیکھا۔

❁❁❁❁❁